دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۲ ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۰۸ء عدد ۵

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

سالانہ زرتعاون

ہندوستان	۲۲۰ روپے۔ فی شمارہ ۲۰ روپے۔	رجسٹرڈ ڈاک ۲۴۴ روپے
پاکستان، بنگلہ دیش و نیپال	۲۶۰ روپے -	رجسٹرڈ ڈاک ۹۴۰ روپے
دیگر ممالک	۸۸۰ روپے -	رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۶۰ روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۰۰۰ روپے میں دستیاب ہے

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپے میں دی گئی ہیں)

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری / منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

شذرات

اس سال سرسید ڈے کے موقع پر پہلا سرسید احمد خاں انٹرنیشنل اوارڈ فار لٹریچر علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے، صاحب طرز مصنف اور مشہور ماہر تعلیم جناب محمد ذاکر علی خاں کو تفویض کیا گیا۔ اس اہم ایوارڈ کے لیے اس سے بہتر انتخاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ذاکر صاحب ۱۹۲۶ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے ۱۹۴۵ء میں بی۔ ایس۔ سی اور ۱۹۴۸ء میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلے گئے جہاں کراچی میٹروپالٹن کارپوریشن کے چیف انجینئر اور کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔ لیکن یہ ان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ ان کا اصل کارنامہ جس کے لیے وہ علمی دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں ان کی پیشہ ورانہ مہارت سے یکسر الگ ہے۔ ان کی شناخت علی گڑھ کی اعلیٰ روایات کے امین اور سرسید مشن کے ایک بیدار مغز پاس دار کی رہی ہے۔ ان کی خوبصورت تحریروں میں علی گڑھ کی جن اعلیٰ اقدار کی تصویر کشی کی گئی ہے ان کا بہترین انعکاس خود ان کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں علی گڑھ کے نام کو زندہ رکھنے، علی گڑھ تحریک کے پیغام اور مقاصد کو عام کرنے اور سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے محاذ پر جتنا اور جیسا کام انہوں نے کیا اس کی مثال پاکستان میں تو کیا ہندوستان میں بھی ملنی مشکل ہے۔ پاکستان میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قیام میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا اور گذشتہ پچاس سال سے اس کے سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کراچی میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کی تاسیس میں ان کا رول بہت اہم رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ وہ اس یونیورسٹی کے اعزازی وائس چانسلر بھی ہیں۔ ملی گزٹ نے انہیں بجا طور پر ماڈرن سرسید کے نام سے یاد کیا ہے۔ یونیورسٹی کی طرف سے انہیں پہلے سرسید انٹرنیشنل اوارڈ کی تفویض دراصل ان کی ان غیر معمولی خدمات کا اعتراف ہے جو انہوں نے علم و ادب، تصنیف و تالیف اور سرسید کے مشن کی توسیع کے مختلف الجہات میدانوں میں کی ہیں۔ ہم ذاکر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کا فیض تادیر اسی طرح جاری رہے۔

احسان شناسی ایک بنیادی انسانی جوہر ہے۔ زندہ قومیں اپنے محسنین کے احسانات کو یاد رکھتی ہیں۔ سرسید نے برصغیر کی ملت اسلامیہ پر جو احسان عظیم کیا ہے اس کا حق ہے کہ ان کے تئیں احسان مندی

کے احساس کو زندہ رکھا جائے۔ ۱۷ اکتوبر کو ان کا یوم ولادت منانے کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ دنیا کے طول و عرض میں جہاں علی گڑھ برادری کے چند لوگ بھی موجود ہوں بڑی عقیدت و محبت سے سرسید ڈے منایا جاتا ہے اور اس عظیم ادارہ کے عظیم مؤسس کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح فرزندان علی گڑھ اپنی مادر درس گاہ سے عہد وفا کی تجدید بھی کرتے رہتے ہیں۔ مادر درس گاہ سے ان کی محبت اور تعلق خاطر میں جو والہانہ پن اور شدت پائی جاتی ہے اس کی مثال کسی اور ادارہ کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ وہ جہاں اور جس حال میں بھی رہیں اس کی آغوش شفقت میں گذارے ہوئے لمحات کی یاد سے دل کی دنیا آباد رکھتے ہیں۔ یہ جذبہ بہت قابل قدر ہے۔ لیکن سرسید کے احسان عظیم کے تئیں احسان مندی اور جذبۂ تشکر کے اظہار و اعتراف کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سرسید ڈے کو سرسید کے مشن کے ساتھ تجدید عہد کے طور پر منایا جائے۔ سرسید کے مشن کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی اُس وقت تھی۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ سے مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی پس ماندگی کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ حد درجہ تشویشناک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علی گڑھ تحریک کو پھر سے فعال بنایا جائے، اس کے پیغام اور مقاصد کو عام کیا جائے اور سرسید کے مشن کی توسیع کے لیے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بغیر مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں باعزت زندگی گذارنے کا تصور بھی محال ہے۔ ملک میں قائم تعلیمی اداروں سے ہر ممکن سطح پر استفادہ کی کوشش کے ساتھ ساتھ خود اپنے تعلیمی اور فنی اداروں کی تاسیس وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ مسلمانانِ ہند کے تعلیمی احیاء کی مہم میں ہراول دستہ کا کردار ادا کریں گے۔ یہ ان کا فرض بھی ہے اور ان کے اوپر ملت کا قرض بھی۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹی کو ایک مثالی ادارہ بنایا جائے۔ اس سال سرسید ڈے کے موقع پر کچھ ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن سے مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کے انتقال سے علم و دانش کے میدان میں بالعموم اور فارسی زبان و ادب کے میدان میں بالخصوص جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ ان کے علمی اکتسابات اور تحقیقی فتوحات کی فہرست بہت طویل ہے اور اسی طرح ان اعزازات کی بھی جو انہیں تفویض کیے گئے۔ ایران، افغانستان، وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا کے علاوہ یوروپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں ان کے نام اور کام کا بڑا احترام اور اعتراف پایا جاتا تھا۔ ان کی علمی اور تحقیقی دلچسپیوں کا میدان بہت وسیع تھا اور علم و

فن کے کتنے ہی تاریک گوشے ان کی فکری کاوشوں سے روشنی میں آئے لیکن تدوین وتحقیق متن اور فرہنگ نویسی ان کے خاص موضوعات تھے جہاں ان کا علم وفن نئی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ دیوان حافظ کے دو قدیم ترین نسخوں کی تحقیق وتدوین کے علاوہ انہوں نے متعدد اہم متون کی بڑی ژرف نگاہی سے تدوین کی اور تحقیق متن کا ایک معیار قائم کیا۔ حافظ پر اپنی تحقیقات کی وجہ سے وہ حافظ شناس کے خطاب سے موسوم ہوئے۔ مصوری، خطاطی اور موسیقی جیسے مختلف النوع موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان موضوعات پر انہوں نے بڑا وقیع تحقیقی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایسے متنوع اور گوناگوں اوصاف وکمالات جمع ہوگئے تھے کہ انہیں دیکھ کر علماء سلف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ علم، فضل اور شہرت وناموری کے اتنے اونچے مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود ان کے مزاج میں بڑی سادگی، انکسار اور تواضع تھی۔ اپنے خوردوں سے بھی بڑی خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے۔ ان کے مقام ومرتبہ کا ادراک صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ کسی علمی موضوع پر اظہار خیال کرتے۔ دارالمصنفین سے ان کا بڑا دیرینہ اور قلبی تعلق تھا اور اس کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ طویل عرصہ سے معارف کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیقات معارف کے صفحات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ راقم الحروف کو ذاتی طور پر ان کی شفقت طالب علمی کے زمانہ سے حاصل تھی اور وہ عزیز جہاں منزل میں مقیم تھے، اور نماز کے لیے ہمارے ہال کی مسجد میں آتے تھے۔ اپنی علمی عظمت، جلالت اور یونیورسٹی انتظامیہ میں اپنے بڑے مقام ومنصب کے باوجود ایک طالب علم سے جس طرح ملتے تھے اس کی خوش گوار یاد دل میں ابھی تک تازہ ہے۔ بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ اپنے فضل خاص سے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ ان کی وفات پر ان کے دیرینہ رفیق پروفیسر مختارالدین احمد کے تاثرات اسی شمارہ میں شامل اشاعت ہیں۔

وسائل کی شدید قلت کے باوجود اب تک معارف کے مسلسل بڑھتے ہوئے خسارہ کو کسی طرح پورا کیا جاتا رہا ہے اور اس کا بار معارف کے قدردانوں پر ڈالنے سے احتراز کیا جاتا رہا ہے لیکن اب اسباب طباعت کی بڑھتی ہوئی گرانی اور بیرونی ممالک کے ڈاک خرچ میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک دونوں کے زرتعاون میں اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے۔ یہ اضافہ جنوری ۲۰۰۹ء سے نافذ العمل ہوگا۔ معارف کے قدردانوں سے تعاون کی درخواست ہے۔

مقالات

ماحولیاتی بحران، اسباب وعلاج
(سائنس اور قرآن کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ)

پروفیسر سید مسعود احمد*

(۳)

اب ہم مندرجہ بالا آیات کی ایک جامع تشریح پیش کرتے ہیں تاکہ نفس مسئلہ کے اسباب اور علاج کی مزید جہات سامنے آئیں اور آیات کے تعلق سے ممکنہ سوالات کا جواب بھی آجائے۔

اولاً: کائنات میں میزان، موزونیت، تقدیر اور تصریف سے دراصل یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نظام عدل وحسن وتوافق پر قائم ہے اور یہ اوصاف اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کے مظاہر ہیں جن کو فطرت کائنات سے موسوم کیا جاسکتا ہے، چونکہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ (الرحمٰن: ۸) یعنی اس میزان میں سرکشی نہ ہو، اس کا مطلب ہے کہ انسان کو یہ تصرف واختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس میزان میں خلل اندازی کرسکتا ہے مگر اس کا نتیجہ لازماً فساد فی الارض کی شکل میں ظاہر ہوگا اور یہ فساد فی الارض بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ (الروم: ۴۱) یعنی انسان کے کرتوت کا طبعی نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کا اگلا مرحلہ اور اخلاقی نتیجہ عذاب خداوندی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (الفجر: ۱۳)، اس سلسلہ میں دو ممکنہ محرکات عمل ہیں، وہ یہ کہ یا تو فطرت کے نظام کمال میں خلل اندازی شعوری ہو اور یا غیر شعوری، اگر شعوری طور پر جانتے بوجھتے فطرت سے کھلواڑ کیا جائے تو وہ فرد مخصوص اس ظلم کا ذمہ دار ہوگا اور یہ عمل اخلاق وشریعت کے دائرہ میں آجائے گا ورنہ فساد فی الارض اور اس کا فطری وطبعی نتیجہ تو لازماً ظاہر ہوگا مگر اس کی اخلاقی ذمہ داری سے بنابریں سبکدوش ہوجائے گا کہ وہ

* شعبہ بایوکیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

اس معاملہ میں لاشعوری طور پر غلطی کر بیٹھا، لہٰذا وہ مکلف نہ رہا، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے غیر ارادی طور پر کسی کے ہاتھ سے بندوق چلنے پر کسی شخص کو گولی لگ جائے، ہم سب جانتے ہیں کہ گولی لگنے سے نقصان و تکلیف تو نظام فطرت کے تحت مجروح کو جھیلنا ہے اور انصاف کا تقاضا نظام اخلاق وشریعت کے تحت مارنے والے پر پورا ہونا چاہیے، وہ بالکل بری بھی ہوسکتا ہے اور کچھ سزا بھی پاسکتا ہے، اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (فتح:۲۳) اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا (فاطر:۴۳) فرماتا ہے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی، گویا اللہ کی سنت یہ ہے کہ فساد فی الارض، شعوری عمل کا ثمرہ ہو یا لاشعوری غلطی کا نتیجہ، اس کا فطری وطبعی نتیجہ ہلاکت وخسران کی شکل میں لازماً ظاہر ہوگا، تاکہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الروم: ۴۱) کا حق ادا ہوسکے، اب ایک تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ فرد مخصوص اپنے علم کی حد تک کسی انفرادی غلطی کا شکار تو نہ ہو مگر نظام باطل کو بہ خوشی روبہ عمل لانے پر ممکنہ فساد فی الارض اور کوئی مخصوص ماحولیاتی بحران ظاہر ہوگیا تو رب العالمین کے حضور جواب دہی سے بچ نہ سکے گا۔

ثانیاً: سورۂ ہود کی مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فساد فی الارض سے روکنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا، ہماری حقیر رائے اس بارے میں یہ ہے کہ جو فساد فی الارض انسان کے اخلاقی دائرہ میں ہوتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی سنت وہ ہے جو قرآن مجید کی اس آیت میں ذکر کی گئی مگر جو فساد طبیعیاتی دائرہ میں ہوتا ہے، اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی کے تحت لاگو ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ ایک قابل لحاظ نکتہ پھر بھی رہ جاتا ہے کہ ہمیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل روکنے والے کون ہیں، بہ ظاہر اس کے انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ فساد فی الارض سے بچانے والے اس دنیوی عذاب سے بھی بچ جائیں۔

ثالثاً: اب ذرا اسراف اور امانت کے تعلق سے بھی مزید وضاحت پیش کردی جائے، امانت اصل میں نعمت کو منعم حقیقی کی طرف پھیر دینے اور جیوں کا تیوں رکھنے سے عبارت ہے، جس سے خیانت کا امکان نہیں رہتا اور اسراف کسی معاملہ میں حد سے گزر جانے کو کہتے ہیں، عموماً اس سے مراد حد بندگی کو پار کردینا ہے، اللہ تعالیٰ نے طبیعاتی اور غیر طبیعاتی دونوں میدانوں میں یعنی طبیعاتی

اور اخلاقی دونوں دائرہ اعمال میں اسراف سے منع فرمایا ہے، طبیعاتی میدان کار میں اسراف یہ ہے کہ انسان فطرت کے دائرہ سے نکل کر مصنوعیات اور تصنع کو پسند کرنے لگے، اخلاقی سطح پر اسراف کم ظرفی اور استکبار کی علامت ہے تو طبیعاتی میدان میں اسراف، ناشکری اور تصنع کی علامت، چنانچہ اس منفی انسانی صفت (Negative Human Quality) کی قباحت وشناعت کو اس دنیا میں واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے طبیعی میدان میں فساد فی الارض کی شکل میں ظاہر کرکے یعنی اسراف کی ہلاکت خیزیوں کو متشکل کرکے اس دنیا ہی میں دکھادیا، گویا اسراف کے حقیقی چہرہ کا دنیوی مظہر ماحولیاتی بحران کی موجودہ شکل ہے، اسی طرح انسان نے جو مختلف بداعمالیاں کیں ان کا حقیر ظہور دنیا میں بھی ہوجاتا ہے اور حسد کی مثال اس سلسلہ میں کافی واضح ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ حاسد اپنے حسد کی آگ میں اس دنیا میں بھی جلتا رہتا ہے، آخرت میں تو عذاب النار اس کے لیے مقدر ہے ہی، بلکہ یوں کہیں کہ حسد کی اصل حقیقت کو وہ آخرت میں پہنچائے گا۔

رابعاً: انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور اس کی امتیازی صفت علم وشعور کی آگہی ہے مگر صرف کسبی علوم یعنی عقلی وتجرباتی علوم اس کی حقیقی فلاح ونجات کے لیے ناکافی ہیں، لہٰذا تجربہ وتاریخ گواہ ہیں کہ جب بھی انسان نے اپنی عقل وتجربہ کو کافی سمجھا اور تسخیر کائنات کی گاڑی کو خدا تعالیٰ کے دست تصرف سے چھین کر خود چلانے کی کوشش کی اور اپنی کوتاہ علمی اور کج عقلی کے علی الرغم نہ سڑک کی حدود کا خیال رکھا اور نہ سمت سفر متعین کی تو اس سے جانے اور اَن جانے بے شمار حادثے (Accidents) تو ہونے ہی ہیں جو ماحولیاتی بحران کے مختلف مظاہر کی شکل میں جھیلنے پڑ رہے ہیں، بہر حال کہنا یہ ہے کہ علم ہدایت کی لائٹ جلائے بغیر اندھیرے میں گاڑی چلانے پر جو ہونا تھا سو ہوکر رہا اور ماحولیاتی بحران کے مختلف مظاہر قرآن حکیم کی حقانیت کا منہ بولتا ثبوت بن گئے اور انسان جاہل کتاب کائنات کے اوراق کی تحریف کی ناکام کوشش میں کتاب الٰہی کے مطابق خود داستانِ عبرت بن گیا اور آیات اللہ کے صحیح مفہوم سے جبراً آشنا ہوگیا اور شاید اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت کے بے شمار حقائق میں سے چند پہلوؤں کی نقاب کشائی کردی کہ:

سَنُرِيْهِمْ آيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ — یعنی عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں

اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (فصلت: ۵۳) بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔

خامساً: پانچواں نکتہ مندرجہ بالا آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو خلیفہ اور امانت الٰہی کے حامل کی حیثیت میں (احزاب: ۷۲) نیز بہ حیثیت افضل مخلوق (بنی اسرائیل: ۷۰)، جس حد تک بھی رب کائنات نے تصرفات کائنات کی اجازت دی ہو ان معاملات میں وہ مالک یوم الدین کے حضور سخت جواب دہی کے لیے تیار رہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ادنیٰ لغزشوں کو بھی تربیتاً یہاں معاف نہیں کرے گا۔

یہ چار سو سالہ تاریخ انسانی کا بڑا المیہ ہے کہ بنی آدم نے اسی ازلی دشمن آدم ابلیس کو اپنا دوست بنا کر اپنے ہاتھوں ہی اپنی ہلاکت کے سامان کر لیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حضور احساس جواب دہی سے غافل مغربی سائنس دانوں نے ظلم پر مبنی حالاں کہ ٹکنالوجی بہ ذات خود ظالم یا عادل نہیں ہوتی مگر جب سائنس دانوں کی نیتیں اور صارفین کے رویے بدل گئے اور ترقی براہ حق تلفی عام ہوگئی تو یہ گویا ظلم پر مبنی ہی تھی، ٹکنالوجی ایجاد کی جس سے کائنات اور ماحول کے حقوق پامال ہوئے اور اس سے آگے بڑھ کر خدا بیزار سائنس نے سائنس دانوں کو ایسا شتر بے مہار بنا دیا جس کے پھل وہ ماحولیاتی بحران کی شکل میں کھا رہے ہیں اور آخرت کی سزا رہی وہ الگ، اس بحران کا مثبت اخلاقی پہلو یہ ہے کہ سائنس داں اپنی کوتاہ علمی اور غلطی پر کم از کم متنبہ تو ہوئے ہیں، اب اگر کوئی حکمت سے حق واضح کردے اور صحیح رہنمائی کر سکے تو لوہا گرم ہے، بس صحیح چوٹ کی ضرورت ہے۔

۶: چھٹا اہم نکتہ اس بحث کا یہ ہے کہ جب ہم مغربی سائنس پر تنقید کرتے ہیں تو دراصل ان خدا بیزار نظریات، ناقص طریقہ کار اور فطرت کے تئیں مغرب کے غیر فطری رویوں پر تنقید کرتے ہیں، جن کا نتیجہ موجودہ ماحولیاتی بحران کی شکل میں سب کے سامنے ہے، اس کی تشریح مزید اس طرح ہے کہ چونکہ خدا کا انکار اَبدہ البدیہیات (Natural Logic) کا انکار ہے اور اس احمقانہ خیال سے پوری انسانی زندگی فساد کا شکار ہوجاتی ہے، ناقص طریقہ کار کے ذریعہ نابیناؤں کی

طرح ہاتھی کو ستون، رسّہ، چھاج وغیرہ سمجھنا تو بالکل مشکل نہیں البتہ اس سے نتیجہ کیا نکلے گا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہوائی جہاز (Air-bus) میں بڑی بس کا انجن لگانے پر ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ دور ضرور اڑ جائے مگر اس کے بعد جو حادثہ رونما ہوگا، وہ ہم سب کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے، بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ طریقہ تخفیف (Reductionism) کو مسلمانوں نے فروغ دیا بلکہ ایجاد بھی کیا، یہ ایک تاریخی بحث ہے مگر ہمیں اسے اسلامی طریقہ سائنس کہنے میں اس وقت تک انکار ہے جب تک کہ ہم کو واضح حکم خداوندی نہ ملے، اگر یہ صحیح ہو بھی تو کیا مسلمانوں کی غلطی اسلام کے کھاتے میں جانی چاہیے، تیسرا مسئلہ فطرت کے تئیں غیر فطری رویوں کا ہے، اس میں کیا ابہام ہے؟ اگر آج ہم مصنوعیات (Artificials) کو فطریات پر ترجیح دیتے ہیں تو کیا یہ غیر فطری رویہ نہیں ہے؟ کیا آج پوری دنیا یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ انسان کے نوّے فیصد مسائل طریقہ زندگی (Life-style) میں فطریت سے دوری کی وجہ سے ہیں، میں خود ایک حیاتیاتی سائنس داں ہوں اور یہ پڑھاتا ہوں کہ نظریہ ارتقا کے مطابق انسان اور ماحول (Environment) بہ معنی فطرت سے تعامل کے ذریعہ لاکھوں سال میں جسمانی نظام میں ہم آہنگی قرار پائی ہے، اسی طرح سارے اکوسسٹم (Ecosystem) میں توازن قائم ہے، اب کیا کسی کو اس سے انکار ہے کہ دنیا میں مصنوعیات زندگی کے ہر شعبہ میں چھا گئی ہیں اور فطرت کہیں خال خال ہی نظر آتی ہے تو کیا انسانی راحت و آرام (Human Comfort) حاصل کرنے کا یہی ایک ممکن ذریعہ ہے، اگر ہم نے ایرکنڈیشنر کی مثال کے ذریعہ باطل نظام حیات اور نظام سائنس کے نقصانات اسی نظام کے بیانوں سے سمجھا دیے تو اس میں حرج کیا ہے، بلکہ عین درست طریقہ یہی ہے اور ہم پوری احساس ذمہ داری سے اس علم کی روشنی میں جس کے ہم ابتدا سے طالب علم رہے ہیں، یہ عرض کر رہے ہیں، ہاں آپ کو سکون و ٹھنڈک چاہیے تو اس کو اسلامی نظام کے تحت اور فطرت کائنات کے دائروں میں تلاش کیجیے، ٹکنالوجی کی ترقی سے اسلام کو کوئی بیر نہیں، بلکہ قرآن مجید کے مطابق سب سے پہلے عالم انسانیت کے ایک اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اور اس کی وحی کے مطابق بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (ہود: ۳۷) ایک کشتی بنائی، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے لوہا نرم کر دیا، تاکہ وہ زرہیں بنا سکیں (سبا: ۱۰-۱۱) نیز اللہ تعالیٰ نے

لوہے کو قوت اور انسانی ضرورت کی علامت (الحدید:۲۵) قرار دیا اور اب تو متبادل ٹکنالوجی وقت کی ضرورت بن گئی ہے اور یہ آواز مشرق و مغرب دنیا کے بھی گوشوں سے آرہی ہے۔

۷: اسی طرح ہمارے مقالہ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں سائنسی تعلیم و تحقیق کی ان حالات میں امت مسلمہ کے لیے شاید وکالت نہیں کروں گا یا فروغ سائنس و ٹکنالوجی کے لیے عالم اسلام کی سردمہری پر نہیں جھنجھوڑ دوں گا، میرے نزدیک سائنس بہ عنوان العلم مسلمانوں کی میراث اور قرآنی تحریک دعوت و تدبر کا نتیجہ ہے (۱) اور آج امت مسلمہ دنیا میں سب سے زیادہ اسی لیے مغلوب و مقہور ہے کیوں کہ وہ جدید ٹکنالوجی سے مسلح نہیں اور وہ مغرب کی دست نگر بن کر رہ گئی ہے ورنہ سورۂ انفال کی آیت ادبار (انفال:۱۶) کی روشنی میں حسب ضرورت اور مناسب حال دشمنان اسلام کے خلاف تیاری ہوتی تو وہ ٹیڑھی نظر سے بھی نہ دیکھتے، میری ان گزارشات کا ایک مقصد تو اس مادیت پرستی، آرام طلبی اور تصنع و مصنوعیات پسندی سے امت مسلمہ کو چھٹکارا دلا کر جفاکشی اور فطرت کی خوبیوں کی طرف توجہ دلانا بھی تھا، کیوں کہ انہیں غیر اسلامی نظریوں اور رویوں نے ہماری جہادی روح کو بھی سلب کرلیا ہے، اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ میں نے توازن و اعتدال قائم کرنے کی غرض سے افراط و تفریط پر مبنی رویوں کی نکیر بڑے زور و شور سے کی ہے، یہ بادنیٰ تامل آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ مقالہ میں کہیں تناقض (Self Contradiction) نہیں ہے اور میں امت وسط کے ایک فرد کی حیثیت سے اعتدال و توازن کا حامی اور زمانہ کے ساتھ ترقیات کا علم بردار ہوں۔ (۲)

۸: ایک اور مسئلہ جس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ ہے سائنسی تحقیقات اور تکنیکی دریافتوں میں اسلام کے ترغیبی پہلو کو خصوصاً قرآن مجید کی آیات متعلقہ خلافت آدم (البقرہ:۳۰)، علم الاسماء (البقرۃ:۳۱)، تسخیر کائنات (لقمان:۲۰؛ ابراہیم ۳۲-۳۴)، تکریم بنی آدم (بنی اسرائیل:۷۰) اور نبی آخر الزماں آنحضورؐ کی حدیث مطہرہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" کی روشنی میں سمجھنا، جہاں ایک طرف انسانی ضرورت و ارتقا کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف ماحولیاتی مسائل ماضی کی تکنیکی ترقی پر کھلا طمانچہ بن کر سب کے سامنے ہیں، ہماری حقیر رائے اس معاملہ میں یہ ہے کہ قرآن مجید بلاشبہ سائنسی تحقیقات کے لیے غیر معمولی تحریک فراہم کرتا ہے،

جس کا عملی ظہور امت مسلمہ کی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے جیسا کہ ہمارے گزشتہ مضامین سے بھی واضح ہے (۳،۴)، مگر اس تحریک و ترغیب کا مطلب ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ وہ غیر مشروط تحقیقات کا حامی ہے، اس کی تفصیلی وضاحت کے لیے تو ایک مستقل مضمون درکار ہے، البتہ ان میں ہر نکتہ کا اجمالی جواب اس طرح ہے:

۱- خلافت ارضی کا اصلی مدعا اس زمین میں انسان کی بہ حیثیت نائب خداوندی دوسری مخلوقات ارضی پر انتظام و انصرام کی ذمہ داری ہے اور جس طرح فلاحی ریاست (Welfare State) میں حکومت کی ذمہ داری رعایا کو ہر طرح سے مطمئن رکھنا اور خوش رکھنا ہوتا ہے اسی طرح انسان کو دیگر مخلوقات خداوندی کو خوش و خرم رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

۲- تکریم بنی آدم اسی فضیلت کا دوسرا نام ہے جس میں مندرجہ بالا ذمہ کے ساتھ شکر گزاری کا عنصر غالب ہو جاتا ہے۔

۳- تسخیر کائنات انسان کو اس خلافت ارضی کی حقیقی اہلیت عملاً ثابت کرنے کی خدائی تعبیر ہے۔

۴- عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کی کم از کم دو تعبیریں مشہور و معروف ہیں: (الف) اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ عقل و شعور عنایت فرمایا جس سے وہ صحیح و غلط میں تمیز کر سکے اور خلافت ارضی کی ذمہ داری کا اہل ہو سکے، (ب) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ان کی نسل میں ہونے والے اولوالعزم انبیا و رسل کے نام سکھا دیے، جس سے فرشتوں کا خوں ریزی و فساد کے تعلق سے اشکال رفع ہو سکے، اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم ہدایت عطا کرنے سے پہلے ہی فرشتوں کو سجدہ کا حکم دے کر حضرت آدم کے علم اسماء کی وجہ سے بالاتری کو ثابت کیا ہے تو اس کو اپنے علم کی روشنی میں کوئی بھی رائے رکھنے کا اختیار ہے، مگر ہماری حقیر رائے اس کے برعکس یہ ہے کہ اس پورے قصہ میں تین ممتاز یعنی نوری، ناری اور خاکی مخلوقات کا آئیڈیل کنڈیشن میں امتحان موضوع بحث ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کے قاری کے سامنے ان مخلوقات کے نمایاں خصائل و اوصاف رکھنا چاہتا ہے، چنانچہ اس امتحان سے پہلے فرشتوں کے سامنے خاکی مخلوق کو خلافت ارضی عطا فرمانے کا اظہار مشیت ایزدی کی طرف سے ہوا، جس پر ان کو چند اشکال تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے

حضرت آدم کو "علم اسماء" سے بہرہ ور فرما کر اس خلجان کو بھی دور کیا اور ساتھ ہی فرشتوں کو مع ابلیس یہ حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں جو بہ ظاہر اس حکم خداوندی پر عمل درآمد کرنے یا نہ کرنے کی علامت تھا، جس میں ان دو مخلوقات کو انسان کے "تابع" رہ کر مشیت خداوندی کے تحت ایک محدود دائرہ میں انسان کو تصرفات دینا تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اس اختیار کا غلط استعمال بھی کرے گا، جس میں فرشتوں کا سخت امتحان تھا اور علم ہدایت عطا کرنے سے پہلے غلطی کے امکانات زیادہ تھے اور اس میں فرشتوں کے لیے کچھ زیادہ ہی سخت امتحان تھا اور اس میں ہمارے نزدیک ابلیس کے لیے اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (اعراف: ۱۲) والی کمزور دلیل بھی زیادہ مناسب محسوس ہوتی ہے، بہ الفاظ دیگر علم وحی سے فیض یافتہ اور نور نبوت کے حامل آدم علیہ السلام کے مسجود الملائکہ ہونے میں کیا تردد ہو سکتا تھا اور اسی طرح ابلیس کی چھپی خباثت اُبل پڑنے کا امکان اسی صورت میں زیادہ تھا، جب کہ انسان اس کے سامنے زیادہ حقیر نظر آتا، قصہ آدم و ابلیس کو مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ ہمارے نزدیک اسی طرح لیتے نظر آتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن و تدبر قرآن، جلد اول)

اب رہی حدیث نبوی "انتم اعلم بامور دنیاکم" کی روشنی میں سائنسی تجربات کی غیر مشروط اجازت، جو ہمیں نہیں معلوم کہ فرمان رسولؐ سے یہ کیسے مطلب نکال لیا گیا، جب کہ آپؐ نے یہی تو فرمایا کہ "تم دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو" آپؐ نے یہ کب کہا کہ تم خوب تجربات کرو اور ان میں کوئی اخلاقی بندشیں بھی نہیں ہیں اور آپؐ دوسری بات کہہ بھی کیسے سکتے تھے، جب کہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں، (موطا و مسند احمد، ابوہریرہ)، ہماری حقیر رائے اس حدیث نبوی کے بارے میں صرف یہ ہے کہ مشیت ایزدی نے امت مسلمہ کے لیے حضور نبی اکرمؐ کی صحیح حیثیت معلوم کرنے کا ایک مناسب موقع فراہم کردیا جس کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپؐ دنیوی اور تجرباتی علوم میں امتیازی اور خصوصی ملکہ دے کر نہیں بھیجے گئے تھے، بالفاظ دیگر یہ کہ کسی علوم میں ملکۂ نبوت کو کوئی علاقہ نہیں ہوتا، یہاں مشیت خداوندی کو یہ کھولنا مقصود تھا، ہماری اس رائے کو علامہ سید سلیمان ندوی اور شاہ ولی اللہؒ کی رایوں سے بھی تقویت پہنچتی ہے، علامہ نے فرمایا "اس میں شک نہیں کہ وحی اور ملکہ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت سے باہر کی چیزوں

میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام انسانوں میں ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے" (۵)

بہرحال تجرباتی اور اجتہادی میدان میں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتی رائے ایک طرف اور اس میدان میں آپ کی حیثیت کا تعین بھی زبان رسالت ہی سے کافی و شافی ہم تک پہنچا، البتہ اسی لسان نبوت سے وحی الٰہی پر مبنی قرآنی احکامات تو ہمارے لیے حرف آخر ہیں ہی جس پر کسی کلام کی گنجائش نہیں، ان قرآنی احکامات پر مزید غور و فکر کے لیے چند سوالات پیش خدمت ہیں کہ اگر قرآن انسان کو تجرباتی میدان میں آزاد چھوڑ دیتا ہے تو جیسا کہ بعض لوگ اس حدیث اور قرآن کی روشنی میں سمجھتے ہیں تو کیا سوشل سائنسز اور طبیعیاتی سائنس کی تحقیقات و تجربات میں فرق کیا جائے گا، آخر آدم اسمتھ (Adam Smith) اور مارکس نے بھی تو بعض علمی، تحقیقاتی اور تجرباتی بنیادوں پر ہی اپنے معاشیات کے نظریے پیش کیے، کیا ان نظریات پر عملی تجربہ کرنے کا اسلام ترغیب و اجازت دیتا ہے نیز اگر یہ نظریے غلط ہیں تو کسی نہ کسی مرحلہ میں تو غلطی ہوئی اور آغاز تحقیق سے انجام تک جہاں تک بھی غلطی ہوئی کیا ان کی اس پر کوئی پکڑ نہیں ہوگی، اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں تحقیق و تجربہ علمی ارتقاء اور انسانی راحت و آرام (Human Comfort) کا ضامن ہے تو سوشل سائنس میں بھی علمی ارتقاء ضروری ہے اور وہ بھی اسی طرح ممکن ہے تو کیا کیپٹلزم اور مارکسزم علمی ارتقاء کی علامت ہیں یا تنزل کی، اس طرح ہمیں اس حقیقت کو بھی پیش کرنا چاہیے کہ اگر علم و عقل انسان کا طرۂ امتیاز ہے تو اخلاق بھی اسی کا ہی طرۂ امتیاز ہے اور اگر اخلاق کے بگاڑ سے عالم انسانیت کی ہلاکت ناگزیر ہے، مگر اس کے لیے چشم بصیرت درکار ہے تو آج انسان بہ چشم سر دیکھ رہا ہے کہ علم سائنس اور ٹکنالوجی کے بگاڑ سے ہلاکت بالکل سر پر ہے، نیز یہ بات عجیب لگتی ہے کہ ہم ان لوگوں کو جن کو علم و عقل کی بنیاد پر بڑا کہا جاتا ہے تو تجربہ کے نام پر کھلی چھوٹ دے دیں اور کم علموں کو اللہ کے غضب سے ڈراتے رہیں، جب کہ قرآن و حدیث کی رو سے شیطان ہر طرف سے ہماری گھات میں ہے (اعراف: ۱۷) ہمیں تو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۰ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انسان تجرباتی علوم (اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ) ہی کے

دائرہ میں خاص طور سے جواب دہ ہے (۶) اور اس میں احتیاط کی بھی ضرورت ہے اور اس کا ابتدائی حصہ " ولا تقف ما لیس لک بہ علم " ہمارے خیال کو مزید تقویت فراہم کرتا ہے، اس کے علاوہ ایک اور تجربہ جو سائنسی تحقیقات سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، اس کے بارے میں بھی سوال کریں گے کہ کیا ہیروشیما اور ناگاساکی کے تجربات کی طرح ہمیں دوسرے خطرناک بموں کے حقیقی اور راست تجربہ کی بھی اجازت دے دینی چاہیے اور یہ بات ہم طنزاً یا مذاقاً نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ اس تلخ حقیقت پر توجہ دلانا مقصود ہے جو آج کل صنعتی ممالک غریب ملکوں میں سائنسی تحقیق کے نام پر کھلے اور چھپے دونوں طرح سے کرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان بموں کی مثال سے کیڑے مار دواؤں سے لے کر اصلی بم سبھی مراد ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ان تجربوں کے ذریعہ اپنی مہلک مصنوعات کی ہلاکت خیزیوں کا تماشا دیکھ کر سائنسی آنکڑے جمع کرتے ہیں، اسلام تو کجا کیا کوئی اور ہمدرد انسانیت فلسفہ بھی اس کی اجازت دے گا؟ اب اسلام کی رو سے ایک مسئلہ قائم رہتا ہے وہ یہ کہ تجربہ کے بغیر علم علم نہیں ہے بلکہ وہ ظن و قیاس کی حدود سے باہر نہیں نکلتا سوائے اس کے کہ اس کی حقانیت پر وحی الٰہی کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو تو ایسی حالت میں "علم اور اخلاق" کے درمیان توازن قائم کرتے ہوئے تجربہ کی اجازت دے دینی چاہیے کیوں کہ ایک طرف کمیاتی سطح پر تجربہ کے نقصانات کا تخمینہ لگانا غیر ضروری ہے تو دوسری طرف کیفیات کی سطح پر بالقوہ ہر تجربہ جوکھم (Risk) کا حامل ہوتا ہے، جس کو ایک حد تک نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے، اس سلسلہ میں قرآنی آیات پر مبنی بارہویں نکتہ میں اشارے کیے جاچکے ہیں، لہذا علمی ضرورت، اخلاقی حدود اور انسانی ضروریات میں توازن قائم رکھتے ہوئے تجربہ و تحقیق کو خوردبینی سطح (Micro-level) پر کیا جائے، تاکہ نقصانات کم سے کم ہوں اور اگر یہی پیمانے اور قرآن و سنت کی کسوٹی بسیط سطحی (Macro-level) تجربات کے متقاضی ہوں اور ظاہر ہے کہ ان میں نقصانات کے بجائے صحت و آرام کے مسائل پر تجربات درکار ہوں گے تو انفرادی و اجتماعی ضمیر کو حکم بنا کر تجربات کا تعین اور ان تجربات کی سطح کا تعین کرنا ہوگا،

واللہ اعلم بالصواب واعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

۹- اب میرے نزدیک صرف ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ میں نے ماحولیاتی بحران کے اسباب پر تو خاصا تفصیل جائزہ بھی لیا ہے اور قرآنی نکات بھی پیش کیے ہیں مگر اس کے

علاج و حل کے سلسلہ میں اسی مقالہ میں چند باتوں ہی پر اکتفا کر کے چھوڑ دیا ہے اور بہ ظاہر مقالہ غیر متوازن ہو گیا ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں، اولاً یہ مسئلہ ہماری طبی اصطلاح میں ایک مرض (Single Disease) کے بجائے (Multiple disease or syndrome) کی طرح ہے، لہذا میں بھی اگر مرض کی عمومی علامت (Common Symptom) یعنی درد کے لیے درد کش دوائیں (Pain Killers) تجویز کردوں یا اور آگے بڑھ کر اعضا انسانی میں دل، گردہ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے نظام کو درست کرنے کے لیے مختلف دوائیں تجویز کردوں تو یہ سبب میری نظر میں تخفیف پرستی (Reductionist approach) ہی پر مبنی طریقے ہوں گے جو درست نہیں ہیں جب کہ اصل بیماری میری نظر میں کینسر سے مشابہ ہے اور اس کے لیے طریقہ علاج (Holistic approach) کے مطابق مختلف مریضوں کو الگ الگ نسخے تجویز کرنے چاہئیں لیکن وہ کسی ایک مضمون میں نہیں سما سکتے ہیں، ثانیاً میں خود کینسر پر تحقیق کرتا رہا ہوں اور ان تحقیقات کی روشنی میں میرا نعرہ (Slogan) ہے، (Prevention is better than cure) "کینسر سے" بچاؤ اس کے علاج سے بہتر ہے، یعنی میں ایسی بیماریوں کی روک تھام کا علاج سے زیادہ قائل ہوں اور روک تھام کے لیے بیماری کے اسباب پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، ثالثاً ماحولیاتی بحران سارا کا سارا ایک علمی مسئلہ ہے اور اس کا حل خاصی دقیق علمی بحثوں کا محتاج ہے اور میں ایک اچھے استاذ کی حیثیت سے مکمل جواب دینے کے بجائے اشارے کرنے کا قائل ہوں، تاکہ "العلم کی فطری طرز پر نشو و نما ہوسکے" اور میرا کام اس مقالہ میں اتنا تھا کہ اس سلسلہ میں جامع تعارفی کلمات کہہ دوں، تاکہ اس علمی مباحثہ کو ایک سمت فراہم کر کے لوگوں کو غور و فکر کی ایک نہج متعین کر دی جائے، اب بہت سی آرا آئیں گی اور اہل دانش ہر رائے کو مناسب وزن دے کر مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کریں گے۔

۱۰- اب رہا مسئلہ کا دوسرا پہلو کہ تمام سائنسی مسائل کے حل کے لیے عموماً اور اس بحران کے لیے خصوصاً میں کیا نمائندہ راہیں (Guide Lines) پسند کرتا ہوں وہ جامع شکل میں پیش کردوں، میرے نزدیک سائنسی مسائل کے حل کے دو دائرے (Domains) ہیں، پہلا دائرہ کار فنی اور تکنیکی نوعیت کا ہے جس میں احقر دو گزارشات کے ساتھ ماہرین فن کو آزادی دینا ضروری سمجھتا ہے اور اگر یہ کہ وہ لوگ اپنے تکنیکی فن میں بحد استطاعت مہارت حاصل کریں، دوسرے

یہ کہ وہ اپنی تحقیقی کاوشوں میں اپنے ضمیر کو کسی ملامت کا موقع نہ دیں اور پوری دیانت داری سے اور متفقہ (Standard) پروٹوکال (Experimtal Protocol) کے ساتھ کام کریں اور مکمل حقائق دنیا کے سامنے پیش کریں اور ان میں کوئی کتر بیونت کسی خاص نتیجہ حاصل کرنے کے لیے نہ کریں، جہاں تک تحقیقات کا دوسرا دائرہ کار ہے اس میں ہم جملہ سائنس دانوں سے درخواست کریں گے کہ وہ مندرجہ ذیل امور میں خود کو بہترین انداز میں رب کائنات کے حضور جواب دہی کے لیے تیار کریں، ۱- نیت کی درستگی: جو کوئی اہم کام کریں اس میں دنیوی غرض کے بجائے انسانیت کا بڑا فائدہ پیش نظر رہے، ۲- سائنسی نظریہ کی آفاقیت و درستگی پر نظر ہو نیز اپنی علمی کم مائگی کے ساتھ اپنے علم و کاوش پر بھروسہ بھی رہے، ۳- ترجیحات تحقیق و کاوش: اس میں آفاقی، ملکی، سماجی و انفرادی نیز وقتی و دائمی ترجیحات کی روشنی میں اس کام کی اہمیت متعین کریں، ۴- ضرورت: عالمی و ملکی، انفرادی و اجتماعی، کائناتی و انسانی ضرورت کی روشنی میں اس کام کا آغاز کریں، ۵- طریقہ تحقیق (Scientific Method) کے نقص و کمال پر توجہ رہے اور اس کی درستگی کے لیے کوشاں رہیں نیز وجدان و وحی کی گنجائش اگر نکل سکے تو ان کو بھی شامل کرنے کی کوشش کرتے رہیں، ۶- انسانی رویوں کی درستگی جو ان میں سب سے زیادہ آسان فہم ہے اور سائنسی و تکنیکی پالیسیوں کو طے کرتی ہے، مثلاً کوئی ایسی تحقیق جو کسی انسانی گروہ کی حق تلفی پر براہ راست منتج ہو یا معلومات کی حد تک کائنات میں فساد یا فطرت میں عدم توازن کا ذریعہ ہو یا معروف معنی میں بداخلاقی کو ہوا دیتا ہو یا انسانوں میں بہیمیت اور یا جانداروں میں ایسی نئی تخلیق کا موجب ہو جو شدید ضرورت کے زمرہ کے بجائے محض جدت پسندی کی تسکین کا باعث ہو، ایسی تمام سائنسی و تکنیکی کاوشیں قرآن مجید کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتیں، لہذا ارباب حل و عقد اور سائنس داں ان سے اجتناب کریں۔

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کو محیط کامل (Absolute Environment) تسلیم کرنے سے متعلق اپنی حقیر رائے پیش کر دینی بھی مناسب ہوگی، جو لوگ ماحولیاتی نظام پر اسلامی بحثوں سے واقف ہیں وہ بہ خوبی جانتے ہیں کہ بعض مسلم اور غیر مسلم اہل علم حضرات جن میں پروفیسر حسین نصر (۷) اور پی لیک (۸) پیش پیش ہیں، ان کی رائے قرآن مجید کی سورہ النساء کی ایک سو چھبیس ویں آیت "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا" یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہے،

کی روشنی میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی ماحول (Absolute Environment) سے عبارت ہے، راقم اس رائے سے دو وجوہات کی بنا پر اتفاق نہیں کر سکتا، اولاً تو جس ماحول کی دنیا بات کرتی ہے وہ مغربی سائنس کی اصطلاح ہے اور اسی ماحولیاتی بحران سے ہماری بحث ہے ورنہ ہم تو ماحول کی تعریف ہی روحانی، علمی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی شقیں بھی شامل کرتے اور ظاہر ہے کہ سائنسی ماحولیاتی بحران میں کوئی سماجی اور اخلاقی بحران کا ذکر تک نہیں کرتا، دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو حقیقی ماحول (Absolute & Real Environment) کہا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی جملہ صفات (Attributes) کے ساتھ اس تعریف میں شامل ہوگا جس میں بے شمار نزاکتیں ہیں کم از کم "ہمہ اوست دیگرے نیست" اور "نیچر (Nature) ہی خدا ہے، جیسے غیر اسلامی نظریات سے تو ہم بچ ہی نہیں سکتے نیز خدا تعالیٰ اس طبیعیاتی سائنس کے محدود دائرہ میں بھی آجاتا ہے، جس میں مابعد الطبیعیات اپنی اہمیت کھو دیتی ہے، لہذا جب تک سائنس کی تعریف اور ساخت تبدیل نہیں ہوتی اور ماحول کی تعریف اور اس کا دائرہ کار نہیں بدل جاتا نیز جب تک ماحولیاتی مسائل میں سماجی، روحانی اور اخلاقی مسائل شامل نہیں کیے جاتے ہم "محیط" کو اس کے لغوی معنی میں اور اللہ تعالیٰ کو قرآنی اصطلاح میں "محیط" مانتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی "شان محیط" کو سائنس جدید کی تنگ دامانی اور کجی سے آلودہ نہیں کریں گے، بہ غرض محال اگر یہ ساری شرائط پوری ہو بھی جائیں تو بھی یہ مسئلہ بحث طلب رہے گا، کیوں کہ یہ خالص فلسفیانہ مسئلہ ہے اور اس میں خالق و مخلوق کے التباس کا اندیشہ باقی رہے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سائنسی پالیسی ساز اور سائنس داں اسلامی نظریہ کائنات و ماحول اور اسلامی اقدار کی روشنی میں سائنس کو اسلامائز (Islamize) کرنے کو وقت کی ضرورت سمجھیں (۹) جیسا کہ دیگر مسائل حیات میں مثلاً اسلامی بینکنگ میں مغربی اہل علم نے سوچنا شروع کر دیا ہے، مزید برآں قرآنی آیات اور سیرت رسول سے تحریک حاصل کرتے ہوئے وہ ایک متبادل ٹیکنالوجی قائم کریں اور غیر اسلامی اقدار پر مبنی اور دنیائے انسانیت کے لیے خصوصاً اور کائنات کے لیے عموماً مضر اور تخریبی ٹیکنالوجی اور اشیاء سے دست بردار ہو جائیں اور ان پر کلی طور پر بندش (Ban) لگا دیں، ہمارا یقین کامل ہے کہ اسلام مسلمانوں کا دین ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی میراث اور دین فطرت ہے اور اسی کے قائم کرنے

میں انسانوں کی حقیقی فلاح ہے جو اس دنیا سے آخرت تک محیط ہے اور اس کی پوری برکات تو تب ہی ظاہر ہوں گی جب کہ اسلام انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر قائم ہو جائے۔(۱۰)

حواشی و مراجع

(۱) عبد الرشید اگوان کی تالیف "Islam & the Environment" اور متی کٹیال کی تالیف بہ عنوان "Environmental Pollution" ملاحظہ ہوں۔ (۲) تھامس کہن کی کتاب "Structure of Scientific Revolutions" اور ریاض کرمانی صاحب کا مقالہ "Epistemdogical Foundations of Islamic Science"، مطبوعہ MAAS J. Islamic Science, Aligarh، ۱۹۸۷ء، شمارہ ۳، صفحات ۲۱ سے آگے، نیز اسی میگزین کے شمارہ ۵، ۱۹۸۹ء، صفحات ۴۱ تا ۶۸ ملاحظہ ہوں۔ (۳) سید مسعود احمد مضمون بہ عنوان "قرآن اور سائنس" شائع کردہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جنوری - مارچ ۱۹۸۴ء اور اسی مضمون کا عربی ترجمہ البعث الاسلامی لکھنؤ کے تیسرے شمارے ۱۹۸۴ء میں احقر کا نام صرف مسعود احمد لکھا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) سید مسعود احمد مضمون بہ عنوان "حقیقی ترقی کے اسباب اور اسلام" شائع کردہ برہان نئی دہلی، شمارے اکتوبر اور نومبر ۱۹۸۲ء، نیز الحق پاکستان۔ (۵) سید مسعود احمد مضمون بہ عنوان "سائنسی تحقیقات کا قرآنی محرک" شائع کردہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ، شمارہ جولائی - ستمبر ۱۹۸۴ء، ملاحظہ فرمائیں۔ (۶) سید سلیمان ندوی کی معرکۃ الآرا کتاب "سیرۃ النبی" ج ۴، لاہور (۱۹۹۱): الفیصل ناشران کتب، ص ۸۴ ملاحظہ فرمائیں۔ (۷) سید مسعود احمد مضمون بہ عنوان "حصول علم میں حواس خمسہ کا رول - قرآن حکیم کی روشنی میں" شائع کردہ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ، شمارہ ۲، ۲۰۰۶ء۔ (۸) سید حسین نصر (S.Hussein Nasr) مضمون بہ عنوان "Islam andEnvironmental Crisis" شائع کردہ MAAS Jounral of Islamic Science, Aligarh، ۱۹۹۰ء، ج ۲، ص ۳۱ تا ۵۲۔

(۹) پی لیک (P.Lake) کتاب بہ عنوان "Physical Geography" میکملن اینڈ کمپنی کلکتہ، ص ۷، ۱۴ تا ۱۶۱، نیز دیکھیے W.Chittick کا مضمون بہ عنوان "Godsurrounds all things: An Islamic Purpectire on the Environment" شائع کردہ جریدہ "The World and I" ج ۱، شمارہ جون ۱۹۸۶ء۔ (۱۰) سید مسعود احمد مضمون بہ عنوان "قرآن کا تصور علم" شائع کردہ مجلہ آیات ناشر CSOS علی گڑھ، شمارہ جنوری - اپریل ۱۹۹۲ء، اسٹیفن مشل (Stephens Mitchel) کا مکتوب جو مابعد جدیدیت کو سمجھنے میں اہمیت کا حامل ہے انٹرنیٹ پر دیکھیے at journalism.nyu.edu/faculty/files/Stephens-postmodern.pdf

"We are all post-modem now (2007)"

عصر رواں میں شبلی کی معنویت

ڈاکٹر سید عبد الباری صاحب٭

علامہ شبلی نعمانی کو رخصت ہوئے قریب قریب ایک صدی کا عرصہ گزرنے کو آیا لیکن یہ عجب شخصیت تھی جو اپنے حیات بخش افکار و خیالات کے ذریعہ نئی صدی میں بھی ایشیا میں امن و اتحاد کے لیے کام کرنے والوں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے آرزومند افراد اور اداروں کے لیے سرچشمۂ توانائی بنی ہوئی ہے، انہوں نے انیسویں کے آخری عشروں میں جب کہ ہندوستان انگریزوں کا غلام ہو چکا تھا اور مغرب سے ذہنی و فکری مرعوبیت کی سیاہی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی، اپنی تحریروں سے پوری قوم کو جھنجھوڑ دیا اور ذہنی مرعوبیت کے دلدل سے نئی نسلوں کو نجات دلانے کی کوشش کی، یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ اس وقت جب کہ کارلائل، آرنلڈ ہکسلے وغیرہ کے حوالوں کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک کوئی بات معتبر نہ تھی، شبلی نے مسلمانوں کے اندر تاریخی شعور بیدار کیا، وہ تاریخی شعور جسے مغرب نے مسلسل ان کی تاریخ و تہذیب کو داغ دار بنا کر ان کے اپنے ماضی پر اعتماد کو کھرچنے کی مسلسل کاوشیں کی تھیں، اس وقت کے مصنفین بالعموم مغرب پر مشرق کی برتری کی بات زبان پر لانا تو درکنار اس رخ پر سوچنا بھی لاحاصل تصور کرتے تھے، شبلی نے انگریزی علوم و فنون اور تہذیبی رنگ و روغن سے مرعوبیت کا بیت عنکبوت اپنی قلم کی جنبشوں سے پارہ پارہ کر دیا، شبلی کے اندر غیر معمولی بیباکی و جرأت تھی، اہل یورپ نے مسلم سلاطین، علوم اسلامیہ اور پیغمبر اسلامؐ و اصحاب رسولؐ کے اندر عیوب نکال کر ان کی صورت مسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھیں، مسلمانوں کی اس وقت کی نسل خود اپنی تاریخ پر شرمانے لگی تھی اور خود اپنے اسلاف پر حقارت کی نگاہ ڈالنے لگی تھی، اس احساس کمتری کے جھاڑ جھنکاڑ کو علامہ

٭ ہڈہ، ضلع امبیڈکر نگر، یوپی۔

نے صاف کر دیا اور یورپ کی علمی بالادستی کے رعب داب کا پردہ چاک کر دیا، مستشرقین کے حوالوں کی کمزوری اور غلطی کو چن چن کر تلاش کیا اور اسے دنیائے علم و دانش کے سامنے رکھ دیا، اسی روایت کو یعنی جدید تمدن کی مصنوعی چمک دمک سے نجات دلانے اور اپنی اقدار و روایات پر اعتماد بحال کرانے کی کوشش شبلی کے بعد علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دارالمصنفین میں شبلی کے جانشین علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ نے جاری رکھی اور صاف صاف یہ آواز بلند کی ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

شبلی کا یہی تیور آج بھی نئی صدی میں خوددار و ہوش مند اہل قلم کو توانائی عطا کر رہا ہے جو مغرب کے استعماری عزائم اور اس تہذیب کے فتنہ و فساد اور ذہنی آوارگی اور انسانیت عامہ کی توہین آمیز کاوشوں سے بیزار ہیں۔

شبلی ایک بیدار مغز اور باخبر انسان تھے، وہ جس دور میں پیدا ہوئے تھے، وہ ہندوستان بلکہ ایشیا کی غلامی کا عہد تھا، ترکی کی حکومت ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ رہی تھی، ہندوستان میں مغربی مستعمرین کا سیاسی، تہذیبی شکنجہ لوگوں کو بے دست و پا بنائے ہوئے تھا، اس عہد میں خالص طبقۂ علما سے تعلق رکھنے والا یہ دلیر انسان اپنی قوم اور ملت کو سیاسی اعتبار سے بیدار ہونے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا پیغام دے رہا تھا، مولانا سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

"سیاست کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا تاہم وہ سیاست کے ہمیشہ دلدادہ رہے لیکن ان کی سیاسیات کا یہ رتبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جز ہے یعنی اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون سے جو شیفتگی تھی، اس کا فطری اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے تھے، اس کو مجسم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی"۔ (شیخ عطاء اللہ، مقالات یوم شبلی-شبلی ایک پین اسلامسٹ، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ء)

ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لیے سراپا سپاس تھے، دوسری طرف یورپ کی دست برد سے ہمہ تن فریاد، شبلی جہاں ملکی سطح پر ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے وہیں عالمی سطح پر ملت کی نشاۃ ثانیہ کے آرزومند اور پین اسلامزم کے حامی، ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے بعد یورپ کے مظالم کو دیکھ کر وہ مغرب سے جو حسن ظن رکھتے تھے، وہ بھی ختم ہو گیا، اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی مشہور نظم "شہر آشوب اسلام" لکھی جس میں وہ فریاد کناں ہیں ۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم — مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے — عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

آج تقریباً سو سال بعد بھی یہ اشعار ہمارے دل کی آواز ہیں کہ آج بھی ہم امریکا کی چیرہ دستیوں کے خوفناک مناظر مشرق وسطیٰ میں دیکھ رہے ہیں، وقار عظیم کے الفاظ میں:

"یہ آواز ایک صاحب بصیرت مورخ کی بھی ہے، ایک حق پسند سیاسی مبصر کی بھی اور ایک بے باک شاعر کی بھی، جس نے تاریخ اور سیاست کے حقائق کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے اور شاعر کو مصلحت کی راہ چھوڑ کر حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے"۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شبلی کے اس کارنامے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے:

"مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ان میں خوداعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جنھوں نے الہلال کی نظموں اور مسلم گزٹ کے مضامین کے ذریعہ برطانیہ کی وفاداری کی پالیسی اور مسلمانوں کی کمزور سیاست پر سخت تنقید کی اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو متاثر کیا"۔ (ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۷۳)

شبلی نے ۱۹۱۲ میں نہایت بصیرت افروز طویل مضمون بہ عنوان "مسلمانوں کی پولیٹکل

کروٹ'' تحریر کیا جو قسط وار مسلم گزٹ لکھنؤ میں شائع ہوا اور جس کی پانچویں اور آخری قسط ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی، اس مضمون کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں کو سیاست میں شریک ہونے کی تحریک دی اور سیاست میں عدم شرکت کی پالیسی پر تنقید کی، وہ سرسید کے سیاسی نظریہ کے خلاف تھے جو منفی انداز کا تھا اور جو برطانیہ کو خوش رکھنے پر مرکوز تھا، شبلی کو اس پر افسوس تھا کہ یہ الفاظ یعنی ابھی وقت نہیں آیا ہے ابھی ہم کو پولیٹکس کے قابل بننا ہے، اس قدر دہرائے گئے تھے کہ قوم کی رگ و پے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ ان خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے، شبلی کے نزدیک:

> ''اس سیاسی رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام جماعت میں جب پالیٹکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دہراتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدو جہد، سعی، کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے سناٹا چھا گیا''۔ (مسلمانوں کی سیاسی کروٹ، مقالات شبلی، ج ۸، قومی و اخباری مضامین کا مجموعہ، معارف پریس، اعظم گڈھ، ص ۱۵۸)

شبلی ایک مفکر و مجتہد تھے، وہ پرانی لکیر پیٹنے کے قائل نہ تھے اور نئے حالات کے مطابق نئی اسٹریجی بنانا ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ سرسید سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

> ''کیا ہماری تمام عقل و سمجھ، دل و دماغ، تجربہ و مشاہدہ، جذبات و احساسات، سب اس لیے بیکار ہو جانا چاہیے کہ کسی ریفارمر نے کسی زمانہ میں ہمیں اس قسم کی تعلیم دی تھی''۔

علامہ شبلی کی ۱۹۰۹ء میں رفارمر اسکیم سامنے آئی تو اس سے اختلاف ظاہر کیا، اس اسکیم کے تحت مردم شماری کی نسبت مسلمانوں کی تعداد کونسل میں کچھ زیادہ معین کرنے کی بات کہی گئی تھی، شبلی کے خیال میں اس ترمیم کے باوجود مسلمان مائناریٹی میں رہیں گے، شبلی کے خیال میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملک کے مستقبل کی تعمیر میں ان کا قائدانہ کردار ہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے، اس طرح مسلمان مائناریٹی ہونے کے باوجود اپنی قدر و قیمت تسلیم کرا سکتے ہیں، انہیں

علی گڑھ سے شکوہ تھا کہ اس نے جہاں مولانا محمد علی، سجاد حیدر یلدرم اور ظفر علی خاں جیسے صحافی، انشا پرداز اور دلیر افراد کو جنم دیا وہیں بدرالدین طیب جی و سید علی امام جیسے سیاست دانوں کو منظر عام پر نہ لاسکا، شبلی کے خیال میں جسم کے جس حصہ کو استعمال نہیں کیا جاتا وہ ناکارہ ہو جاتا ہے، انہوں نے سرسید کے اس خدشہ کو غلط ثابت کیا کہ اگر کوئی مسلمان کونسل میں کام کرنے کا اہل نکل بھی آئے تو اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے کلکتہ اور شملہ میں قیام کر سکے گا، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''کاش آج سرسید زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ ایک مسلمان نہیں کئی اور کئی سے بھی زیادہ کلکتہ اور شملہ کا سفر کرتے ہیں اور ہفتوں وہاں موجود رہتے ہیں اور ہر قسم کے مصارف برداشت کرتے ہیں''۔ (مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ، ص ۱۶۸)

شبلی انسانیت کی ادنی و اشراف میں تقسیم کے بھی مخالف تھے اور اسلام کے انسانی مساوات کے اصول پر ایمان رکھتے تھے، انہوں نے جاگیردارانہ طرز فکر کو اسلامی روایات کے خلاف قرار دیا اور نئے عہد میں اسے بدلنے پر زور دیا، انہوں نے سرسید کے اس خدشہ پر کہ اگر حکومت نے مقابلہ کا امتحان ہندوستان میں رائج کر دیا تو یہاں ادنی درجے کے لوگ اشراف پر حکومت کریں گے، طنز کیا کہ:

> ''اس وقت تمام چھوٹی ذاتوں کے لوگ اعلا عہدوں پر پہنچ گئے ہیں اور بڑے بڑے تیس مار خانوں اور نسل تیمور اور آل ہاشم نے ان کے آگے گردنیں جھکا دیں''۔ (ص ۱۶۸)

جناب مظہر مہدی کے الفاظ میں شبلی نے سرسید کی سیاست کو بدلے ہوئے حالات میں فرسودہ قرار دیا، اس لیے کہ جو شمع رات کے وقت جلائی جائے وہ دن میں رہنمائی نہیں کر سکتی، اگرچہ وہ سرسید کی دلیری کی بھی تعریف کرتے ہیں، شبلی مسلم لیگ کی سیاست کو بیکار چیز سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان کی نظریاتی بنیادیں شملہ ڈیپوٹیشن کی سیاسی فہم پر تھیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے اپنی تیس سالہ سیاسی جدوجہد سے حاصل کیے ہیں اس میں مسلمانوں کا حصہ

متعین کر دیا جائے، شبلی نے اس کیفیت کو اپنی نظم ''کفران نعمت'' کے ان اشعار میں پیش کیا ہے، جس میں کانگریس کو شیر سے اور لیگ کو لومڑی سے تشبیہ دی ہے، شبلی نے لیگ کو متوجہ کیا کہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے جن پر ملک کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، مثلاً کاشت کاروں اور غریب کسانوں کا مسئلہ لیکن وہ بڑے بڑے تعلقہ داروں اور زمین داروں سے مربوط تھی، اس لیے اس طرف توجہ نہ کی گئی، نو آبادیاتی نظام کی مضرتوں پر ان لوگوں کی نگاہ نہ تھی، دوسری طرف کاشت کاروں اور غریب کسانوں کے احوال پر شبلی کی گہری نگاہ تھی جو فاقہ کشی کے شکار تھے، انہوں نے مشورہ دیا کہ مشترک مسائل میں لیگ کو کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے، انہوں نے سیاسی بیداری کے لیے اردو زبان میں سیاست کی مشہور کتب کا ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا، انہوں نے عوام سے ذاتی روابط قائم کرنے اور ایسے کتابچے شائع کرنے کا بھی مشورہ دیا جو دلائل اور معلومات و اعداد پر مبنی ہوں''۔ (ایضاً ص ۱۸۳)

شبلی کا خیال تھا کہ برطانوی سامراج کے اصل چہرے کو سامنے لانے کے لیے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے جس کی خاطر شبلی عوام کو نظری سیاست اور عملی سیاست دونوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ (بحوالہ اردو دانش وروں کے سیاسی میلانات، ص ۱۷۰)

شبلی اپنے ان احساسات کو اپنی نظم ''مسلم لیگ'' میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت — کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے
عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجیے — فسانہ ستم و جور ناروا کہیے
درازدستی پولس کا کیجیے اظہار — مقدمات کے حالات فتنہ زا کہیے
گزر رہی ہے جو کچھ کہ کاشت کاروں پر — یہ داستان المناک و غم فزا کہیے
کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجیے جرأت — جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہیے

شبلی سیاست کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر رکھتے تھے، ان کے خیال میں ''پالٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے، وہ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے، وہ انسان کے تمام جذبات کو زندہ کرتا ہے، اس سے تمام قوتیں مشتعل ہوتی ہیں، وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار و خود فروشی پیدا کر دیتا ہے''۔ (ایضاً ص ۱۷۹)

شاید ایک مظلوم و محکوم ملک کے باشندوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے سیاست کی یہ مناسب تعریف تھی، شبلی کی تقریباً ساری نظمیں سیاسی رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، یہ ان کی سیاسی بصیرت کی غماز ہیں، مسجد کان پور کے حادثہ پر ان کی نظم ''ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں'' جنگ طرابلس و بلقان پر ترکوں سے خطاب، شہر آشوب اسلام، علمائے زندانی، خیر مقدم ڈاکٹر انصاری وغیرہ سب سامراج مخالف سیاسی شعور اور غیر معمولی ملی و وطنی جذبہ کے تحت وجود میں آئیں، شبلی کو افسوس تھا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان سیاسی طور پر غفلت کے شکار تھے، شبلی نے ان صحافیوں اور لیڈروں کی سخت مذمت کی جو ہندوؤں، مسلمانوں میں تفریق و نفاق کا بیج بو رہے تھے۔

شبلی کو نئی دنیا میں اس لیے یاد رکھا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے، بہ قول خورشید الاسلام

''حالی و شبلی دونوں اس لائق ہیں کہ ہم ان کے سامنے سر نیاز جھکائیں، انہوں نے نئی دنیا میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، انہوں نے نئی تعمیر میں حصہ لیا، انہوں نے مرثیے بھی لکھے اور روایات کے چہرے سے گرد و غبار بھی ہٹایا اور مسلمانوں میں وہ جذبہ پیدا کیا جس سے تقدیر بدل جاتی ہے''۔

(تنقیدیں، ص ۵۹)

یہ سچ ہے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کو اخلاقی و روحانی اعتبار سے سرفراز کرنا تھا، وہ بیشک ماضی کی روایتوں پر حال کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے نزدیک ماضی توہمات کا مجموعہ نہیں تھا، شبلی نے سرکار دو عالمؐ سے لے کر مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار کی یادگار شخصیتوں تک کے کارناموں کو قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ بیسویں صدی میں ان کی ضرورت و اہمیت کو از سر نو محسوس کیا جانے لگا، خورشید الاسلام صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ وہ ماضی کو زندہ قوت مان کر حال پر فتح پانا چاہتے تھے، لیکن ان کی یہ بات غلط ہے کہ شبلی زمانے کا ساتھ دینا نہیں چاہتے تھے یا شبلی پرانی بنیادوں پر پرانے نقشوں کے مطابق تعمیر کرنا چاہتے تھے، شبلی حالی سے کم حقیقت پسند نہ تھے، وہ مغربی تہذیب سے مرعوبیت ختم کرنے کے لیے اپنی ملت کے مذہبی جوش

کو برانگیختہ کرنا چاہتے تھے اور اس پر انہیں فخر تھا، وہ انگریزی داں طبقہ کے بارے میں خوش گمان نہ
تھے، اس لیے کہ اس کی بے حد مکروہ صورت انہوں نے دیکھی تھی، اپنے ایک خط میں مولوی محمد سمیع
کو لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے
دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام ہے''۔

اس کا ایک اور نمونہ پروفیسر خورشید الاسلام کے ان افسوس ناک تاثرات میں نظر آتا ہے
جو انہوں نے شبلی پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اہل مذہب کے بارے میں ظاہر کیے ہیں:

''علامہ شبلی کی برادری کے کسی رکن نے بھی تلاوت قرآن کی مدد سے
آج تک کوئی نظریہ زمین آسمان کے بارے میں قائم نہیں کیا، اگر یہ سانحہ ہوا ہے
تو ابھی تک صیغۂ راز میں ہے''۔ (تنقیدیں، ص ۵۰)

بیچارے خورشید الاسلام اب دنیا میں نہیں رہے لیکن افسوس تلاوت قرآن نے صدیوں
سے مسلسل انسان کے مقدرات کی تزئین اور تسخیر کائنات کے ولولہ سے انسانوں کو سرشار کرنے کا
جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے سمجھنے کی انہوں نے کوشش نہ کی، خدا ان کو معاف کرے کہ وہ یہ سمجھ
بیٹھے کہ انشا پردازی سے حیات و کائنات کی گرہ بھی کھل سکتی ہے۔

شبلی کی نئے عہد میں معنویت کو سمجھنے کے لیے ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ان کے
خطوط سے خاصی مدد ملتی ہے جن میں ان کی شخصیت بے نقاب ہوئی ہے اور ایک روشن مستقبل کی
تعمیر کے لیے ان کے عزائم اور ارادے واشگاف ہوتے ہیں، بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں
ملک کے مختلف حصوں میں آریہ سماج کے کارکن دور دراز کے علاقوں میں مسلمانوں کی کم علمی و
جہالت کا فائدہ اٹھا کر انہیں راہ حق سے بھٹکانے کی کوشش کر رہے تھے، شبلی اس فتنہ کے تدارک
کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسلم عوام میں تعلیم عام کی جائے، تاکہ وہ اپنے مذہب و عقیدہ سے صحیح
طور پر روشناس ہو سکیں، شاید یہ بات ہر دور کے لیے درست ہے کہ جب جب لوگوں پر جہالت
کے پردے پڑے ہیں، حق کی روشنی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے، شبلی بے چین تھے کہ
اسلام کے شان دار ماضی سے ہماری نئی نسلیں پوری طرح روشناس ہو سکیں، علی گڑھ سے اپنے

زمانہ پروفیسری مولوی حکیم محمد عمر کو لکھتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم میں کس جوش خروش کے ساتھ نماز ادا کی
جاتی ہے اور سرسید کی آمین بالجہر کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، ''میں بھی
کبھی اسلام پر لیکچر دیتا ہوں، مجھ کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی
حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا''، پھر وہ اپنے وطن عزیز کے
ان نوجوانوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں جو ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھتے ہیں، شبلی
نے اس زمانہ میں اشاعت اسلام کے لیے اپنے احباب کو متوجہ کیا اور خود بھی کئی مقامات کے
دورے کیے، حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام اپنے مکاتیب میں اس سلسلہ میں اپنی مشکلات
کا ذکر کرتے ہیں، ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''بڑی مشکل ہے کہ دیہات میں جا کر تلقین اسلام کرنے والے واعظ
نہیں ملتے، اس کا کیا علاج ہوگا، اشاعت اسلام کی کارروائی تمام تر اس پر موقوف
ہے''۔ (انتخاب مکاتیب، ص ۱۹۶)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''اشاعت اسلام کے لیے مجھ کو خود ایک بار دورہ کرنا ہے''۔ (ص ۱۹۵)

عماد الملک بلگرامی نے قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں شروع کیا تو شبلی نے ایک
مکتوب میں اس پر خوشی ظاہر کی، ارتداد کو روکنے کے لیے شبلی کی فکر مندی منشی محمد امین زبیری کے
نام ۱۷/ اپریل ۱۹۱۲ء کے مکتوب سے ظاہر ہوتی ہے، زبیری صاحب بھوپال میں مہتمم دار الانشا
تھے ''میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک
درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم
کرنا مقصود ہے لیکن چوں کہ گرمی سخت ہو رہی ہے، اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا، اسی طرف سے
بھوپال آؤں گا، سیرت نبوی کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا، یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی
طرح دو برس میں انجام نہیں پا سکتا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، اس لیے
جلدی کرنا ہے''۔

شبلی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک آنے والے طوفان کو آنکھوں سے دیکھ

رہے تھے اور آرزو مند تھے کہ انسان دوستی اور عدل و مساوات کے پاسبان مذہب اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں کا تدارک مثبت اقدامات کے ذریعہ کیا جائے، حبیب الرحمن خاں شیروانی کو ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں:

"ادھر اشاعت اسلام کی یہ حالت ہے کہ بیسوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں، آریوں کی مقامی کمیٹیاں جابجا دیہات میں قایم ہوتی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے، کہاں کہاں واعظ مقرر کیے جائیں، کہاں کہاں مکتب قایم ہوں، یہ تو سلطنت کا کام ہے" (انتخاب مکاتیب ص ۱۹۷)

شبلی کی پوری زندگی سراپا حرکت و عمل تھی اور ان کا ہر ہر لمحہ علم و حکمت کا چراغ جلانے کے لئے وقف تھا، وہ مغرب کے علم و حکمت میں اسلام کی روح ڈالنا چاہتے تھے تاکہ وہ خالص مادیت سے نکل کر اسلام کی روشنی میں منور ہو سکے، وہ اپنے عہد کے نامور اہل علم کی جو اسلامی بیداری کے لئے سرگرم عمل تھے، مسلسل حوصلہ افزائی کر رہے تھے، مولانا آزاد نے جب "الہلال" کا ایک مشن اور ایک تحریک کی شکل میں کلکتہ سے آغاز کیا تو شبلی بے حد خوش ہوئے، مولانا آزاد کو ۲۰/اگست ۱۹۱۳ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"آپ نے بہت اونچا نصب العین رکھا ہے ورنہ جی یہ چاہتا تھا کہ سب طرف سے صرف نظر کر کے وہیں آرہتا اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا، اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشاں حال اور پریشاں عمل ہو رہے ہیں، کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ ہر طرف بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے۔" (انتخاب مکاتیب ص ۲۰۱)

بلقان کی جنگ کے وقت شبلی ترکوں کی اعانت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فرض عین سمجھتے تھے، یہی وہ مرحلہ تھا جب کہ ہندوستانی عوام میں ایشیا کے دوسرے حصوں میں مظلوم انسانوں کے لئے ہمدردی اور ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا، شبلی ظفر علی کو لکھتے ہیں: بھائی ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، کیا

ترکوں کی جان مینڈھے سے کم ہے، یہاں جلسے میں میں نے چند شعر پڑھے تھے

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
بکھرتا جاتا ہے شیرازۂ اوراق اسلامی — چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک
حریفوں کو گلہ ہے آسماں سے خشک سالی کا — ہم اپنے خوں سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں — کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

شبلی نے اس وقت جرائد اسلامیہ کے نام اپنے بیان میں ترکوں کی اعانت کو اس وقت فرض عین قرار دیا تھا، اسی زمانہ میں ترکی کی حکومت مدینہ میں ایک یونی ورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنا رہی تھی اور شبلی اس سلسلہ میں فکر مند تھے، اس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے، پروفیسر عبدالباری کو ۱۰/جون ۱۹۱۳ء کو رقم طراز ہیں:

"بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں، تم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں لیکن علمی مذاق پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہتا ہوں، سخت افسوس یہ ہے کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خربازاری بڑھ گئی ہے، نیک و بد کی تمیز مطلق نہیں"۔ (انتخاب مکاتیب)

شبلی کی روشن خیالی اور فکر و عمل کی ندرت اور ولولہ انگیزی سے، بہت سے لوگ بیزار تھے، ان پر طرح طرح کے الزامات لگا رہے تھے، حتی کہ ان کی زندگی کے سب سے اہم کارنامے یعنی سیرت النبی پر بھی اعتراضات کیے جا رہے تھے، شبلی اس کا ذکر ایک خط میں کرتے ہیں:

"آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لیے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے لیکن دین دار نہیں لیکن ان ہی دین داروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، یقین فرمائیے زمانہ کی خربازاری دیکھ کر زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواص تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہے"۔ (شبلی، ۲۹/مئی ۱۹۱۳ء بنام ابوالکلام سید عبدالحکیم دسنوی)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود پر بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ خذ ما صفا کرے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد و رشک کے سوا اور کوئی جوہر موجود نہیں ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں''۔ (ص ۲۰)

شبلی کو قوم کی تعلیمی صورت حال کی جس قدر فکر تھی وہ اس عہد کے کم اہل علم و معماران قوم کو تھی مگر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی راہ کا اصل روڑہ ان کے نزدیک مسرفانہ طرز حیات تھا، مولوی مسعود علی ندوی کو اپنی وفات سے چند روز پیشتر لکھتے ہیں:

''میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصل ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے ہیں، ہندو اسی سے بازی لے گئے اور قیامت تک لے جائیں گے، میں اپنے مصارف برابر گھٹا رہا ہوں، سرمائی کچھ نہیں بنوائی، پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو ختم کر لے جائے گی، بھائی ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا ہو اور رہے گا وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بیکار ہے''۔ (انتخاب مکاتیب، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۲۴۱)

شبلی نے اپنے عہد شباب ہی میں اپنے خط میں تعلیمی اداروں کے قیام کی مہم شروع کی، ۲۰ رجون ۱۸۸۳ء کو شبلی کی کوششوں سے اعظم گڈہ میں نیشنل اسکول قائم کیا گیا، اسی زمانہ میں اپنے منجھلے بھائی محمد اسحاق کو لکھتے ہیں کہ تم کو ان پہلوؤں پر لحاظ رکھنا چاہیے:

۱-نیشنل اسکول کا قائم رکھنا کیوں ضروری ہے۔ ۲-کیا بہ لحاظ حالات موجودہ اور توقعات آئندہ وہ مستقل طور پر قائم رہ سکتا ہے۔ ۳-ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان جن میں تم بھی ایک بلند پایہ پر ہونے کا حق رکھتے ہو، اس کے کچھ کام آسکیں گے۔ شبلی بھائی کو یہ تلقین کرنے کے بعد کہ وہ قانون کی تیاری میں الٰہ آباد کے بجائے اعظم گڈہ آ کر کریں، لکھتے ہیں:

''اس بات پر خیال کرو کہ یہ اسکول ہم لوگوں کے خیالات اور

حوصلوں کا ایک عمدہ نمونہ اور مشغلہ ہے، ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کو عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے، آخر وہ کیا چیز ہے جس کو مخصوص صورت میں ہم ایک قومی کام کہہ سکتے ہیں، ہم میں سے جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے، ان کے لیے اپنی قومی فیاضی کے صرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر کیا موقع ہوگا، سردست میرے نزدیک بھی وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا تھا اور جو بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درخش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا''۔ (انتخاب مکاتیب، ص ۱۷۷)

شبلی اور ان کے اہل خاندان اور احباب نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں اس اسکول کے قیام کے لیے جس فراخ دلی سے زمین مہیا کی اور عمارت تیار کی، وہ پورے شمالی ہند میں ایک نمونہ بن گئی اور اسی زمانہ میں مختلف شہروں میں اس انداز کے اسکول مسلمانوں نے قائم کیے، اس ایثار و قربانی میں اس قدر اخلاص تھا کہ یہ سرزمین محور علم و فن بن گئی اور شبلی کالج نے بیسویں صدی میں گھر گھر میں جدید علوم کا چراغ روشن کر دیا اور اس تعلیم کی وجہ سے اس خطہ میں مسلمانوں میں بیداری، خود اعتمادی اور خوش حالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا لیکن اعلا تعلیم کے ساتھ قوم کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور جہالت کی تاریکی مٹانے کی مہم بھی شبلی نے جاری رکھی، انہوں نے گاؤں گاؤں میں واعظ و مدرس بھیجے، خدام الدین کے نام سے انہوں نے ایک تنظیم کی تشکیل کی جس کا مقصود دیہاتوں میں جا کر اسلام کی اشاعت و حمایت اور اس کے استحکام کے لیے کام کرنا تھا، علامہ شبلی نے ہر گاؤں میں نو مسلموں کی مردم شماری، تعلیم اور دیگر احوال کی تفصیلات جمع کرائیں، سید سلیمان ندوی کو اسی زمانہ میں لکھتے ہیں کہ مسلم گزٹ میں دس روپے ماہوار پر ایسے ابتدائی معلموں کے لیے اشتہار دے دو جو دیہات میں جا کر اردو کی ابتدائی کتاب اور قرآن مجید پڑھا سکیں، شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

''یوں تو مولانا کی زندگی ہی حمایت و اشاعت اسلام کے جذبہ سے

سرشار تھی اور وہ اس جماعت کے سرخیل تھے، جس کا کام نیکی کی طرف دعوت دینا
اور منکرات سے منع کرنا تھا لیکن جب مسلمانوں کو مرتد کرنے کا اہتمام کیا جانے
لگا تو ان کوششوں نے شبلی مرحوم کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا، خواجہ کمال الدین
نے جب انگلستان میں اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تو ان کی حوصلہ افزائی کی،
مغرب تک رسول اکرمؐ کی زندگی کی پاکیزہ تصویر پیش کرنے کے لیے مولانا شبلی
نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سیرت النبی کا انگریزی ترجمہ کرنے کے لیے اپنے
شاگرد محمد علی جوہر سے وعدہ لیا تھا، علامہ شیعہ سنی اتحاد کے زبردست حامی تھے، وہ
اہل وطن سے اخوت ومحبت کے رشتے استوار کرنے پر زور دیتے تھے، وہ
ہندوستان کو دارالاسلام یا دارالحرب کے بجائے دارالامن قرار دیتے تھے اور
یہاں کسی کا مال غصب کرنا ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھا“۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ کی سوانح حیات میں تفصیل سے ان گراں قدر خدمات کا جائزہ لیا ہے جو انہوں نے اسلام کی تاریخی وتمدنی عظمت اور علمی جلالت کو نمایاں کرنے کی خاطر انجام دیں، تاکہ قوم کے افسردہ دلوں میں تازگی وتوانائی پیدا ہو، وہ رقم طراز ہیں:

”اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد قرار دیا کہ وہ
اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علما کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ
میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا
کارنامہ ہیں، اس دوسری غرض کے لیے انہوں نے ایسے پرزور مضامین لکھے اور
تقریریں کیں جن سے ہمارے علما کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہوا“۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے تفصیل سے اسلام کی تصویر بگاڑنے والے مغربی مستشرقین کے بالمقابل شبلی کے علمی کارناموں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے:

”ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں
سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے، جنہوں
نے ان ہی کے طریقہ سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور

بتایا کہ اسلام کے فیض وبرکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیائے علم وتمدن کی
بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مروج علوم
میں کیوں کر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈال دی“۔ (حیات شبلی، دارالمصنفین،
اعظم گڈھ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۵)

غرض شبلی نے قوم وملک کو بیدار کرنے، اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور مغرب کی مرعوبیت سے نجات حاصل کر کے خود اپنے علمی سرمایہ اور اپنے ذخیرۂ فکر ونظر کی بنیاد پر کھڑے ہونے اور ایک علمی، فکری، تہذیبی وسیاسی نشاۃ ثانیہ کے لیے پیہم کوشش کی اور ہماری تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا، اس وقت جب کہ ہم اکیسویں صدی کے ربع اول میں ہیں تقریباً ان ہی حالات سے دوچار ہیں جن کا سامنا شبلی کو کرنا پڑا تھا، شبلی نے پامردی سے مغربی استعمار اور مغربی تمدن کی آندھی کا رخ موڑنے کی کوشش کی اور نفسیاتی وذہنی طور پر اپنی قوم کو سربلند ہونا سکھایا، آج بھی مغربی استعمار کی یلغار کی زد میں پورا ایشیا اور پورا افریقہ ہے، مغرب اس بات کی بھرپور کوشش کر رہا ہے کہ ثقافتی اعتبار سے مشرق کو مکمل طور پر مغلوب وخاک بہ سر کردے، مشرق بالخصوص اسلام پر طرح طرح کے جاہلانہ اعتراضات کیے جارہے ہیں، نئی نسل کے ذہن ودماغ کو بدلنے اور خود اپنی جڑوں سے ان کو الگ کرنے اور اپنے سرمایہ اقدار سے نفرت کرنے کی طرف موڑتا جارہا ہے، آج ہمیں شبلی بے حد یاد آرہے ہیں اور ہم ان کے لفظ لفظ کو آنکھوں لگانا چاہتے ہیں، تاکہ پھر ہماری رگوں میں بجلی دوڑ جائے اور مغرب کی تاریکیوں سے باہر نکل کر اپنے لیے ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں منہمک ہوسکیں، آج شبلی واقبال کی معنویت جس قدر ہم پر منکشف ہوتی جارہی ہے، ہم ان کی عصر رواں کے لیے ضرورت واہمیت کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور دل سے صدا بلند ہوتی ہے ؎

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام - ایک مطالعہ

پروفیسر مسعود الحسن صاحب

(۲)

پوری بائبل دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں صحف اولیٰ داخل ہیں اور یہ عہد نامہ عتیق (O.T.) کہلاتا ہے، اہل یہود سے اس کی نسبت خاص ہے، دوسرا حصہ عہد نامہ جدید (NT) کہلاتا ہے، اس میں انجیل کے چار مختلف فنون، حواریوں کے فرمودات، احوال اور مراسلے شامل ہیں اور یہ سب عیسائیوں کے صحیفہ خاص ہیں، عیسائیوں میں مختلف فرقے اور مسالک ہیں جن میں دو سب سے بڑے اور معروف ترین ہیں، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ تاریخی اسباب کی وجہ سے اہل انگلستان نے سولہویں صدی میں علاحدہ مسلک قائم کرلیا، جو چرچ آف انگلینڈ کے نام سے موسوم ہے، ان کی اختیار کردہ بائبل Authorised Version کہلاتی ہے جو انگریزی ترجمہ ہے اور کئی معاملات میں کیتھولک بائبل سے مختلف ہے، عقائد میں پروٹسٹنٹ مسلک سے قریب تر ہے، چوں کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی، اس واسطے یہاں کی زبانوں میں بھی زیادہ تر AV کے ہی ترجمے ہوئے، سید احمد نے بھی اسی کو اپنی تفسیر میں استعمال کیا ہے Henry Martin اور John Carey نے اردو ترجمے سب سے پہلے کیے۔

عہد نامہ عتیق کی کتاب پیدائش کے چہار لسانی بیان کے برعکس انجیل کا ترجمہ اور تفسیر صرف اردو زبان میں کی گئی ہے، شاید اس لیے کہ اس کے اولین مخاطب مسلمان اور اردو داں عیسائی تھے، اس کا مقصد مسلمانوں کو انجیل کے متعلق صحیح اطلاع فراہم کرنا اور عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کے متعلق

سابق صدر، شعبہ انگریزی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

مسلمانوں کے جذبات احترام واقرار نبوت سے باخبر کرنا تھا، اس مقصد سے انجیل متی کے پہلے پانچ بابوں کا انتخاب ہوا ہے اور حسب روایت دو تفصیلی مقدمات سے آغاز کلام ہوا ہے، پہلے میں عیسائی مذہب اور فرقوں کی تاریخ ظہور اسلام دی گئی ہے، دوسرا مقدمہ متی کی انجیل کی زبان، تالیف اور ترجمہ سے متعلق ہے، سید صاحب نے عہد نامہ جدید کی تصنیف وتعلیقات پر اپنے خیالات جدید ترین مفسرین اور محققین کی رائے اور ارشادات قرآنی کی روشنی میں قائم کیے ہیں، حضرت عیسیٰ کی حیاتیاتی عمل سے پاک پیدائش، عیسائیوں کے نزدیک ان کا قبر سے زندہ کرکے اٹھالیا جانا، ان کے متعلق مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی خاص اختلاف رائے نہیں سوائے اس کے کہ مسیحی مانتے ہیں کہ وہ مصلوب کیے گئے اور پھر قبر سے ان کے جسم اطہر کو اٹھالیا گیا، جب کہ مسلمان ان کو صلیب پر ہی سے آسمان پر اٹھالینے کا عقیدہ رکھتے ہیں، مگر تثلیث کے بارے میں دونوں میں شدید اختلاف ہے، جو انجیل ہی کے بیان پر مبنی ہے، سید صاحب کا ماننا ہے کہ حضرت عیسیٰ انسانی اور ابن مریم تھے اور چوں کہ وہ حیاتیاتی عمل کے بغیر پیدا ہوئے تھے، اس لیے لوگوں نے انہیں صرف روح القدس کا حصہ مانا، (قرآن نے بھی ان کو روح اللہ کہا ہے) اور چوں کہ جبرئیل نے انسانی شکل میں حضرت مریم کو بشارت پہنچائی تھی، اس لیے ان پر انسان کی نسبت قرار پائی، اپنی تائید میں سید احمد ابن عربی اور بعض دوسرے اکابر واماموں کا حوالہ دیتے ہیں جن کا حضرت عیسیٰ کے متعلق کہنا ہے "ھُوَلا ھُوَ" یعنی وہ (انسان ہے) اور انسان نہیں ہے، وہ قرآن کی آیت " لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ" (ص ۶) کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ خدا کی ذات اور ارادہ حقیقی ہیں اور عیسیٰ کی ذات اور ارادہ اس ناخود یا تابع ہے، چنانچہ سرسید اس بابت میں تو نہیں پاتے کہ خواہ ان کو ابن اللہ سے استعارتاً تعبیر کریں یا روح اللہ اور کلمۃ اللہ کہیں، اختلاف صرف اس قدر ہے کہ فرزند اور روح القدس کی تمیز کے باوجود عیسائی ان کو خدا پکارتے ہیں، اس کی تردید خود بائبل سے ہوتی ہے، اس لیے کہ انجیل متی باب ۴ کی آیت ۱۰ میں خود حضرت مسیح نے فرمایا ہے کہ تو اس خدا کو جو تیرا خدا ہے، سجدہ کر اور فقط اس کی بندگی کر، خود بعض معروف عیسائی فرزند کا لغوی اور جلی مفہوم نہیں مانتے، مسلمان مورخین اور دور اول کے عیسائی بھی خدائے یکتا کے قائل تھے اور عقیدہ تثلیث نے صرف تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں رواج

تبیین الکلام

پایا، چنانچہ قرون اولیٰ میں ایک فرقہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا منکر تھا اور ”منکر“ ہی کہلاتا تھا، تثلیث کے انکار کرنے والے Unitarians کہلاتے تھے، تاریخ شاہد ہے کہ عقیدہ تثلیث کا باقاعدہ اقرار اور اعلان دوبار تردید کے بعد شاہنشاہ Constantine کی کلیسائی مجلس منعقدہ ۳۲۵ء بہ مقام Nice میں ہوا، بیسویں صدی کی جدید تحقیقات بھی عیسیٰ کی الوہیت اور تثلیث کی بدعات قو حزہ کی ہی تائید کرتی ہیں، آغاز عقیدۂ توحید ہی سے ہوا۔ (۱)

۱۹۴۷ء میں بحیرہ مردار کے قرب وجوار سے بائبل کے مخطوطات کی دریافت نے اس کی تفسیر اور تاریخ میں انقلاب برپا کردیا ہے، عہد بہ عہد چھٹی صدی عیسوی تک عیسائیوں کے مختلف فرقوں اوران تضادات کے بارے میں سرسید نے اجمالاً لکھا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عقیدوں کی تشکیل اور تائید میں رہبانی عوامل اور سیاسی نشیب وفراز کس طرح اور کس حد تک کارفرما رہے ہیں۔

لفظ انجیل یونانی مصدر کی معرب شکل ہے اور انگریزی میں اس کے معنی بشارت یا بشیر ہیں، انجیل میں حضرت عیسیٰ کی آمد وحیات اوران کے ذریعہ نجات کی باتیں کہی گئی ہیں اور اس کے چار مختلف متون (Versions) ہیں جو متی، لوقا، یحییٰ اور مارک نے تحریر کیے ہیں، متی جلیل کے رہنے والے یہودی تھے اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے سے پہلے یہودیہ کے ملک میں تحصیل خراج کی خدمت پر مامور تھے، علمائے قدیم مانتے تھے کہ متی کی پہلی انجیل عبرانی میں لکھی گئی، مسلمان بھی یہی مانتے ہیں مگر پھر عبرانی نسخے معدوم ہوگئے، اس لیے بعضوں کے نزدیک انجیل کی ابتدائی زبان یونانی تھی، بہرحال سرسید اس کے عبرانی الاصل ہونے کے آٹھ دلائل خود انجیل کے ابواب وآیات سے دیتے ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے چند اکابر قدما، مثلاً سینٹ آری گن، سینٹ آگسٹائن اور سینٹ کرائی سسٹوم کے اقوال بھی اس کی موافقت میں دہرائے ہیں لیکن بہ تقاضائے انصاف انہوں نے مخالف دلائل کو بھی بحث میں شامل کیا ہے، اس انجیل کے سنہ تالیف پر بھی اتفاق نہیں پایا جاتا مگر گمان غالب یہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے پانچ برس بعد یعنی ۳۷ء یا ۳۸ء میں لکھی گئی، بعض جدید مورخین اس انجیل کے پہلے اور دوسرے باب کو الحاقی مانتے ہیں، مگر سرسید کو اس سے اتفاق نہیں ہے، حالیہ تحقیق کے مطابق قدیم ترین اور

معارف نومبر ۲۰۰۸ء

سنہ انجیل مارک کی ہے۔

متی (St Matthew) کا پہلا باب حضرت عیسیٰ کے نسب نامہ اوران کی پیدائش کے متعلق ہے، بعض پرانی یہودی روایتوں میں یوسف کے نسب نامہ میں کھوٹ بتائی جاتی ہے، مگر عام مسیحی علما اس سے متفق نہیں، سید صاحب سورہ مریم کے حوالے سے لکھتے ہیں ”ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے تمام آبا اور تمام امہات ولد الحرام ہونے کی ناپاکی سے پاک اور بری ہیں“ (ص ۲۹)، تیسرا باب تاریخی واقعات پر مبنی ہے، اس میں حضرت عیسیٰ کی زیارت کے واسطے تین مجوسی اکابر کی آمد کا ذکر ہے، ملک کے حاکم ہیروڈ کے ظالمانہ حکم کے مطابق تمام معصوم بچوں کے قتل کا بھی تذکرہ ہے، جو حضرت عیسیٰ کو بچپن ہی میں ختم کردینے کے واسطے جاری کیا گیا تھا اور اسی اندیشہ کی وجہ سے یوسف انہیں مصر لے گئے تھے، مخالفین کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر انجیل کے بیان کے مطابق مجوسیوں کی رہبری کرنے والا معجزاتی ستارہ دو سال تک چمکتا رہا تو پھر دوسروں کو کیوں نظر نہیں آیا اور نہ اس کا کسی تاریخ میں ذکر ہے، سید صاحب اس کی ہمدردانہ توجیہ یہ کرتے ہیں کہ یہ ایک روحانی تجربہ تھا اور اس کی روشنی کو وہی دیکھ سکتا تھا جس کا دل روحانی تجلی سے منور ہو، انجیل میں مذکورہ مقامات وجغرافیائی تفصیلات کے سلسلہ میں عیسائی علما اور مفسرین کی رائیں دی گئی ہیں مگر سید صاحب کا خیال ہے کہ مذکورہ اطلاعات کچھ پرانی اور اب معدوم کتب سے لی گئی ہیں اور اس لیے صحیح ہیں، یہاں وہ ایک عام غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتے ہیں، عام عیسائیوں کا خیال تھا کہ ان کے واسطے مسلمانوں کی اصطلاح نصاری، یہودیوں کے لفظ ”نصرین“ سے مشتق ہے اور ہتک آمیز ہے لیکن یہ حقیقت نہیں، لفظ نصاری شہر ”ناصرہ“ سے منسوب نہیں ہے بلکہ عربی لفظ ”نصر“ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی مدد یا مدد کرنا ہیں، اس کی سند ”جواہر القرآن“ میں بھی ملتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں ”مگر خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جس مراد سے یہودی اس کا استعمال کرتے ہیں، اس ارادہ سے ہم مسلمان ہرگز ان لفظوں کا کبھی استعمال نہیں کرتے، کیوں کہ اس طرح کا استعمال ہمارے مذہب کے بہ موجب کفر ہوگا“۔ (ص ۶۱)

بعثت مسیح سے پہلے حضرت یحییٰ کو بھیجا گیا تھا جو اعمال حسنہ کی تلقین کرتے اور دریائے اردن میں بپتسمہ دے کر لوگوں کو پاک کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ توبہ کرو، آسمان والے کی

بادشاہت کا ظہور قریب ہے، یہ دراصل حضرت عیسیٰ کی بعثت کی بشارت تھی، مگر عیسائی علما کی رائے میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک یہ بابل کی آزادی کی خوش خبری تھی، دوسرے اسے حضرت مسیح کی آمد کے بارے میں سمجھتے تھے، سید احمد کی یہی رائے تھی، بائبل کی اصطلاح Pharisee کے متعلق انہوں نے وضاحت پیش کی ہے کہ یہ لوگ خود کو عام یہودیوں سے جدا مانتے تھے، نہایت مغرور و ریاکار تھے مگر ان کی خیرات و عبادات دکھاوے کی تھیں، تاکہ مذہبی مقتدا کہلائیں، وہ یوم حشر اور جزا و سزا کے قائل تھے، ان کے نکتہ چیں کہتے ہیں کہ انہوں نے احکام الٰہی میں تغیر و تبدل کرلیا تھا مگر سرسید کو اس الزام سے اتفاق نہیں تھا، ان کی دلیل تھی کہ حالانکہ حضرت عیسیٰ نے ان لوگوں کو منافق و مکار کہا ہے مگر کہیں بھی ان کے اقوال کو برا نہیں کہا، ایک دوسرا فرقہ صدوقین (Sadducees) کا تھا جو خود کو اہل انصاف کہتے تھے لیکن حشر اجساد فرشتوں کے وجود اور روح کی بقا کے منکر تھے، سزا و جزا کے بھی قائل نہیں تھے، بعض علما مسیح کی الوہیت کی دلیل میں یحییٰ کا یہ قول نقل کرتے تھے کہ میں عیسیٰ کی نعلین اٹھانے کے لائق بھی نہیں، سید صاحب کی رائے میں جوتیاں اٹھانا صرف بہ طور محاورہ استعمال ہوا ہے، جس کا مقصد اظہار تعظیم کے سوا کچھ نہیں ہے، اس طرح ورس ۱۲ کو سرسید عام رائے کے برعکس یہودیوں کی بربادی کی پیشین گوئی نہیں مانتے، بلکہ اسے روحانی گراوٹ کا استعارہ سمجھتے ہیں، اسی طرح ورس ۱۷ کے ترجمہ میں خدا کو عیسیٰ کا باپ کہا گیا ہے، وہ باپ سے مراد ناصح یا رہبر لیتے ہیں اور توجیہ کی سند میں کتاب پیدائش کے باب ۴۵ کی آٹھویں ورس کا حوالہ دیتے ہیں، مزید ثبوت کے بہ طور انہوں نے عہد نامہ قدیم وجدید سے ۲۱ مثالیں پیش کی ہیں، جن میں لفظ باپ یا بیٹا صلبی مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے ہیں (ص ۸۰-۸۲)، قرآن کی سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۹ بھی اس دعوا کی تصدیق کرتی ہے۔

باب ۴ میں شیطان کی طرف سے حضرت عیسیٰ کی چار آزمائشوں کا بیان ہے، ان کی اہم تعلیمات بھی اس باب میں شامل ہیں اور ان کے معجزات بھی، آزمائشوں کے حوالہ سے سید صاحب حضرت عیسیٰ کی مبینہ الوہیت سے انکار کا ثبوت اخذ کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر وہ خدا یا اس کا فرزند ہوتے تو شیطان کی ان کی آزمائش کا کوئی مطلب نہیں، ورس ۱۶ کے سلسلہ میں وہ Vulgate میں دیے ہوئے آیت نمبر اور اس کے مفہوم کو درست نہیں مانتے، بلکہ عبرانی متن کو ترجیح دیتے ہیں (ص ۹۳)۔

معارف نومبر ۲۰۰۸ء

یہ تمام امور اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا مختلف متون (Versions) کا مطالعہ بالااستیعاب اور ناقدانہ تھا، استدلال ان کی فطرت میں داخل تھا، وہ جید علما اور بڑے ناموں کے احترام کے باوجود ان سے بیجا طور پر مرعوب نظر نہیں آتے۔

پانچویں باب میں حضرت عیسیٰ کا پہاڑ پر وعظ، یوم مبارک کی تعبیر، معاصی کبیرہ سے اجتناب کی ہدایت، صبر کی تلقین اور دشمنوں سے محبت آمیز برتاؤ کی ہدایات شامل ہیں، متی کی ورس ۳ کی تائید اور توضیح میں سورہ قصص آیت ۸۳ اور مشکوٰۃ کے باب البغض والکبر سے اقتباسات اور مسلم و ابن ماجہ سے احادیث نقل کی گئی ہیں جس سے اسلامی اور عیسوی مشترک روحانی و اخلاقی قدریں اجاگر ہوتی ہیں، تائید میں امام غزالی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، ورس ۲۱ تا ۲۵ میں گناہ کے مفہوم سے بحث کی گئی ہے اور اللہ کی جناب میں سرزد ہونے والے گناہ اور انسانوں کے خلاف گناہ کے فرق اور شدت کو بہ استدلال واضح کیا گیا ہے، ورس ۳۱ و ۳۲ میں مسئلہ طلاق کا حوالہ ہے اور اس کا موازنہ سورہ مریم کی آیات نمبر ۵ و ۶ سے کیا ہے، نکاح اور ازدواج کی نفسیاتی اور سماجی پہلو پر بھی لطیف اشارے شامل ہیں، طلاق کے مسئلہ پر امام غزالی کا بالتفصیل حوالہ ہے اور یہودیوں اور مسلمانوں کے قوانین طلاق کا موازنہ بھی، موخر الذکر زیادہ منصفانہ اور انسانیت نواز ہیں، بعض دوسری ورسوں کی تشریح بھی امام غزالی کے تحاکمات کی روشنی میں کی گئی ہے، حضرت عیسیٰ کی ہدایت کہ دشمنوں سے بھی محبت کرو پر مختلف مسیحی علما، مثلاً ہنری اسکاٹ، برکٹ اور ڈاکٹر واٹسن کے خیالات کا خلاصہ تفسیر میں شامل ہے، سید صاحب کی رائے میں یہ عمل بہ ظاہر ناممکن العمل ضرور ہے مگر نیچر کے خلاف نہیں، حضرت عیسیٰ کے حواری، انبیائے کرام، اہل صفہ اور اولیاء اللہ اس ہدایت پر عمل پیرا رہے ہیں، البتہ ایسا کرنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے، اس لیے مسیح علیہ السلام نے ایک جامع ہدایت فرمائی ہے کہ ہر شخص بہ قدر اپنی طاقت اور قدرت کے اس ہدایت کی تعمیل کرے (ص ۱۲۸)، اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں کہ محبت کے مختلف درجہ ہوتے ہیں، بنی نوع انسان سے عمومی محبت، دوستوں سے محبت، اجنبیوں سے محبت، یعنی ہم غیروں سے کینہ اور عدم التفات نہ رکھیں اور ہر طرح ان کی نیکی چاہیں، بدلہ نہ لیں، نقصان نہ پہنچائیں، اس درجہ کی محبت دشمنوں کے ساتھ ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے، نیک اور پاک باز لوگ اس سے زیادہ

بجالاتے ہیں مگر عام لوگوں کے واسطے اس قدر بجالانا بھی باعث سعادت ہے اور اگر ہم اس کو بھی نہ بجالائیں تو بلاشبہ ہم کم بختی کے جہاز میں بیٹھے اور گناہوں کے سمندر میں ڈوبے ہیں۔ (ص ۱۲۹)

تین حصوں میں منقسم اور تقریباً ۹۰۰ صفحات پر مشتمل "تبیین الکلام" بائبل کے صرف چند اجزا کی تفسیر ہے Authorized Version کے مطابق صرف عہد نامہ قدیم میں ۵۴ کتب ہیں اور پہلی کتاب پیدائش میں ۵۰ باب ہیں، ان میں سے صرف پہلے گیارہ باب پر سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے، اسی طرح عہد نامہ جدید میں کل ۲۷ کتابیں ہیں جن میں چار انجیلیں ہیں جو علی الترتیب متی، لوقا، عون اور کارک سے منسوب ہیں، ان میں سے متی کی انجیل کو منتخب کیا گیا ہے اور اس کے بھی صرف پانچ باب، چنانچہ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے صرف ان چند اجزا کے ترجمہ اور تفسیر پر کیوں اکتفا کیا، کسی داخلی شہادت کی عدم موجودگی کے باعث ہم صرف قیاس ہی کر سکتے ہیں، چنانچہ پہلا ممکن سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ کتاب پیدائش کے سلسلہ میں انہوں نے عبرانی متن اور حوالوں کا بہ کثرت استعمال کیا ہے، "حیات جاوید" سے پتہ چلتا ہے کہ سلیمان نام کے ایک یہودی عالم کو انہوں نے اپنا مددگار مقرر کیا تھا جو تقریباً دو سال تک ان کے ساتھ رہا (۲) اور غالباً ۱۸۶۲ء میں رخصت ہوگیا، اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس کی رخصت کے بعد عبرانی حوالوں کی توضیح وفراہمی میں دقت پیش آئی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدائی منصوبہ ہی صرف چند اجزا تک محدود ہو اور وہ بنیادی معلومات جن کی ان کے نزدیک مسلمانوں کے واسطے واقفیت ضروری ہو، وہ ان اجزا کی بحث وتفسیر سے پوری ہوجاتی ہوں، تصنیف کا عنوان ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ بالخصوص ملت اسلامیہ کے استفادہ کے واسطے لکھی گئی تھی، متروکہ ابواب میں عموماً مسائل نہیں موجود ہیں بلکہ وہ یہودیوں کی تاریخ، انبیاء کے مذکرے، خاص طور سے حضرت ابراہیم کے کوائف اور ان کے جلیل القدر فرزندان سے متعلق ہیں، چوں کہ بائبل کے برعکس قصص الانبیاء کے سلسلہ میں قرآن صرف ضروری اشاروں اور ناگزیر حوالوں پر ہی اکتفا کرتا ہے، اس لیے اختلافات اور ان کی وضاحت کی ضرورت ان کتب بائبل کے بارے میں کم تر ہے، اسی طرح عہد نامہ جدید کی چار انجیلوں میں متی کی انجیل سب سے زیادہ مفصل ہے، اس لیے باقی تین اناجیل پر اظہار خیال غیر ضروری خیال کیا گیا ہوگا، اس انجیل کے دوسرے ابواب بیشتر حواریوں، ان کے موعظات اور

مراسلات پر مبنی ہیں، لہذا ان سب کا احاطہ سید صاحب کے بنیادی مقصد کے واسطے غیر ضروری تھا، علاوہ ازیں مصنف کی بڑھتی ہوئی سماجی، صحافتی اور تعلیمی سرگرمیاں بھی تبیین الکلام کے تکملہ میں حائل ہوسکتی ہیں، یہ ۱۸۶۵ / ۱۸۶۲ میں شائع ہوئی، اسی عرصہ میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام ۱۸۶۴ میں عمل میں آیا، ۱۸۶۲ میں انہوں نے غازی پور میں ایک اسکول بھی قائم کیا، جیسا کہ حالی نے اشارہ کیا ہے، مالی وسائل کی ناقابل برداشت گراں باری بھی ایک سبب ہوسکتی، ان کی سرکاری مصروفیات اور پابندوقت مراسلت اس پر مستزاد ہیں۔

عداوتوں کی پروردہ آسانی سے دور نہیں ہوتیں، چنانچہ سید صاحب کو بھی ابتدا میں گنے چنے ہی ہم نوا میسر آئے اور جیسا کہ انہوں نے جے آرنلڈ کے نام مذکورہ بالا خط میں تسلیم کیا ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی طرف سے وہ "تضحیک" اور "بے بنیاد دھمکیوں" کے ہدف بنے، تاہم ان کو آواز بالکل صدا بہ صحرا بھی نہیں ثابت ہوئی، خود بہ قول ان کے "کچھ لوگ میرے ہم خیال ہوگئے اور بہت سے توہمات فاسد جو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہوگئے"، ایک بڑے مولوی صاحب نے اپنا اظہار پسندیدگی ان پرزور الفاظ میں کیا "میں نے آپ کی کتاب کو پڑھا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وبے شبہ وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے، خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانہ میں آپ ایسے شخص ہیں جو راہ راست کی رہنمائی کرتے ہیں، آپ کی تصنیف ہر سہ شنبہ کو پڑھی جاتی ہے" (مرتب خطوط مولوی اسماعیل پانی پتی کے قیاس کے مطابق یہ بڑے مولوی صاحب مولانا فصیح غازی پوری یا مولوی تراب علی تھے) (۳)۔

کرسچین ٹرال نے سرسید کے دینی رجحانات پر اپنی معلومات افزا اور گراں قدر کتاب میں تبیین الکلام پر پورا ایک باب قائم کیا ہے، وہ ان پر شاہ ولی اللہ کا خاص اثر بتاتے ہیں اور پادری فنڈرس و سرسید کے نظریاتی وعلمی اختلافات کا جائزہ اور سید صاحب ومولوی رحمت اللہ دہلوی کے درمیان ان کا موازنہ غیر جانب دارانہ ہے، وہ سرسید کے "تحریف" کے مفہوم کو زیادہ معقول ومربوط (Precise) بتاتے ہیں مگر ان کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ بائبل کی تحقیق کے جدید اصولوں سے سید ناواقف ہونے کے باعث اپنے پرانے نظریات پر قائم رہے، اس ضمن میں دو باتیں توجہ طلب ہیں اور ٹرال ان کو نظرانداز کرتے معلوم ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سرسید نے وسط

انیسویں صدی کے جدید ترین تفسیری رجحانات اور علما کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے، اس وقت کا غالب رجحان بائبل کی تاریخی یا اعلا تنقید (Historical / Higher) تھا، ایک نہایت نامور مسیحی عالم Ferdinand Christian Bear (1792-1860) جس کو اس وقت کے معروف Tubingen School of Biblical Criticism کا موجد اور امام سمجھا جاتا ہے، اس کے حوالے تبیین الکلام میں موجود ہیں، دوسرے بڑے مصنفین اور بائبل اسکالرز جیسے J.B. Lightfoot، B.F. Westcott اور F.J.A. Hart کے بھی متعدد حوالے شامل کتاب ہیں، یہاں ایک اور اصولی بحث بھی شاید بے محل نہ ہو، کیا کسی تصنیف کو تاریخ نویسی اور تنقید نگاری کے ان معیاروں اور اصولوں پر پرکھنا اور اس کا محاکمہ قرین انصاف ہے، جو اس کے عالم وجود میں آنے کے بعد ظاہر ہوتے ہوں، عقب بینی (Hind Sight) مستقبل سازی کے لیے تو ضروری ہوسکتی ہے مگر استخفاف ماضی کے مقصد سے اس کی کار آفرینی نہ صرف غیر ضروری بلکہ مقتضائے دیانت سے بعید ہے، چنانچہ ٹرال کا یہ فیصلہ برحق کہ تبیین الکلام میں سرسید اپنے پرانے نظریات پر قائم نظر آتے ہیں مگر یہ رائے تو ان کی تحقیقی اور علمی دیانت کا اثبات کرتی ہے، دراصل ٹرال کا فیصلہ مناظراتی تقاضوں کی نفسیات سے متاخر نظر آتا ہے کیوں کہ سرسید کا مدعا مسلمانوں اور عیسائی مناظروں کی تائید نہیں تھا، بلکہ ان کے الفاظ میں ”میری خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو، کیوں کہ قرآن مجید کے مطابق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہوسکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں“ (ص ۲۱)، اس صورت میں معقول طریقہ یہی ہوسکتا تھا کہ دونوں پہلوؤں خاص طور سے متفقہ پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور اگر پھر بھی کوئی متفقہ نتیجہ برآمد نہ ہو تو فریقین بغیر کسی تلخی کے اپنے اپنے موقف پر قائم رہیں اور دل گرفتگی نہ پیدا ہونے دیں، یہی دانش مندانہ رویہ سرسید کا تھا اور اس کی صریح ہدایت سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ میں ہے، اہل کتاب کو دعوت ہے، توحید کا اقرار اور شرک سے انکار کرنے والوں کے لیے آپسی صلح اور تفہیم کی اور اگر یک خیالی ممکن نہ ہو تو سورۂ کافرون کا ارشاد ہے لکم دینکم ولی دین (یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے، ہمیں ہمارا دین کافی ہے) چنانچہ سرسید کے لیے اپنے نظریات کو غیر ضروری طور سے بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سید صاحب کے اس دعوا کا اوپر ذکر آچکا ہے کہ وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے بائبل کا

ترجمہ کیا لیکن زیادہ اہم سوال ترجمہ کا نہیں بلکہ تفہیم بین المذاہب کی کوشش کا ہے، جس میں انہیں اولیت حاصل ہے مذاہب کے تقابلی تبلیغ کی روایت بہ صورت مناظرہ تو بنوعباس (خاص طور سے المامون) کے دور سے جاری تھی مگر معروضی انداز میں مذہب کی تفہیم کی روایت خط منحنی سے زیادہ ہیں، غالباً سب سے پہلی کوشش عبدالکریم احمد الشہرستانی (م ۱۱۵۳ء) کی شہرۂ آفاق تصنیف ”الملل والنحل“ میں ملتی ہے، جس میں انہوں نے بلاکم وکاست مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کے معتقدات کا خلاصہ پیش کیا ہے، اس کے کچھ ہی عرصہ پہلے البیرونی نے ”کتاب الہند“ میں گیتا اور ویدانت کے مرکزی خیالات اور فلسفہ کا خلاصہ پیش کیا تھا، ڈیڑا او دارا شکوہ کی ”مجمع البحرین“ اور ”سراکبر“ کی شکل میں ملتا ہے، شطاری سلسلہ کے بعض صوفیوں نے اس قسم کی کچھ کوششیں ہند و فلسفہ سے متعلق کی ہیں، اس ضمن میں وحدت ادیان کی تلاش کا حوالہ بھی بے موقع نہیں ہوگا، دربار اکبری میں دین الٰہی کی تدوین اور تبلیغ کی داستان عام ہے، مغرب میں اس کے تقریباً سو سال بعد انگریزی کے ایک معروف شاعر Lord Herbert of Cherberrg نے اپنی کتاب De Veritate (1625) میں تمام بڑے مذاہب کے پانچ مرکزی اصول کو یکجا کر کے ایک مشترک فطری مذہب کا خاکہ پیش کیا (۴)، اٹھارہویں صدی میں جرمنی کے فلسفی اور ادیب G.E. Lessing نے تین تمثیلی حکایتوں (Nathan the Wise) کے سہارے وحدت ادیان کا نظریہ پیش کیا لیکن یہ کوششیں نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوئیں، کیوں کہ وحدت ادیان کا بہ ظاہر دل خوش کن نظریہ نفسیات انسانی کی ضد ہے اور گروہی تشخص کی نفی کرتا ہے، انسان کی آزادی ضمیر کو یک قطبی نظام کی راہ دکھاتا ہے، سرسید کی اصلی نکتہ شناسی اور بڑائی یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو ادیان کے معاندانہ مقابلہ اور افضل و کمتر کے فیصلہ کا بیڑا اٹھایا اور نہ مذاہب کو ضم کر کے وحدت ادیان کا غیر نفسیاتی نعرہ وضع کیا، بلکہ انہوں نے مذاہب کو اپنا اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے تفہیم باہمی اور مشترکہ نکات کی تلاش کی کوشش کی، دراصل ان کی تحریک اور بصیرت کے تین ہم رشتہ پہلو تھے، مسلمانوں کی تعلیمی ترقی، ان میں سائنس اور سائنسی مزاج کا فروغ اور بین المذاہب افہام و تفہیم - تبیین الکلام، اس موخر الذکر مقصد کی ایک نہایت اہم مگر ادھوری کڑی ہے، اول الذکر دو کوششوں پر تو برابر توجہ ہوئی، تیسری جہت عموماً نظروں سے اوجھل رہی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے

کہ اس میں سرسید کو دوسرے عالمی مسلم علما اور دانش وروں پر فوقیت حاصل ہے، مثلاً محمد علی پاشا اور جمال الدین افغانی پہلے دو نصب العین کے تو حامی تھے اور مغرب سے خوشہ چینی کے داعی بھی لیکن مغرب کے مذہب کو سمجھنے سے ان کو سروکار نہ تھا، سرسید پہلے شخص ہیں جن کی دور بین نظر نے اس کی اہمیت کو پہچانا۔ (۵)

تفہیم بین المذاہب کے معاملہ میں وہ اپنے وقت سے بہت آگے گئے تھے، The World Parliament of Religions کا پہلا اجلاس شکاگو میں ۱۸۹۳ء میں ہوا جس میں میں زیادہ تر عیسائی مسالک کی نمائندگی تھی، ہندومت اور بودھ دھرم کے نمائندے بھی برائے نام شامل تھے، مسلمانوں کی شرکت تو برائے نام بھی نہیں تھی، ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۶۵ء میں Second Vatican کونسل میں یہ تحریک کھل کر سامنے آئی اور اب بین المذاہب مکالمہ، صلح جوئی و مفاہمت کی ضرورت کا احساس شدت سے محسوس کیا جانے لگا ہے، چنانچہ مسلم دانش وروں اور علما کے ایک وفد کا Vatican کے اقتدار اعلا سے مذاکرات کا پروگرام بھی طے ہوا ہے، تنظیم ممالک اسلامی (OIC) کی حالیہ کانفرنس منعقدہ ۱۳ و ۱۴ ر مارچ ۲۰۰۸ء بہ مقام ڈاکر (Senegal) نے اس بین المذاہب افہام و تفہیم کی تحریک کی کھل کر موافقت کی ہے، کہیں کہیں مقامی نشستیں بھی ہونے لگی ہیں، تہذیبوں کے ٹکراؤ اور انسانیت کش نعروں اور پروگراموں کے درمیان اس تحریک کی افادیت محتاج تعارف نہیں، عالم اسلام میں سید صاحب کی بہ ظاہر معمولی سی تفسیر تبیین الکلام اس کی نقیب اولی تھی، آج کے دور میں خاص طور سے دو سرسید کے وطن میں اس تحریک کی اہمیت و معنویت سے چشم پوشی تباہ کن ہوگی، یہ علی گڑھ تحریک کا لازمی جزء ثالث ہے اور اس کی جانب سرگرم پیش رفت کے بغیر علی گڑھ تحریک ادھوری رہے گی۔

سرسید اکیڈمی اور اس کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر اصغر عباس کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک اہم اور کم یاب سہ جلدی تصنیف کی، یکجا اشاعت نو کر کے ہماری ورثہ شناسی کو مہمیز دی اور یہ کوئی معمولی احسان نہیں مگر جدید طرز پر اس کی ایڈیٹنگ اور تجدید و توسیع روایت کا قرض سید والا کے سپاس گزاروں پر ہنوز واجب الادا ہے، کاش کہ اب ساقی کو صدائے مکرر کی ضرورت پیش نہ آئے۔

مراجع و حواشی

(۱) Karen Armstrong کی معرکۃ الآراء تصنیف - A History of God - The 4000 Year Quest of Judaism, Christianity and Islam (Alfred A.Knopf, New York 1994) دیکھیے صفحات ۱۰۷ تا ۱۳۱۔

(۲) خواجہ الطاف حسین حالی: حیات جاوید (مطبوعہ ادارہ ادبیات، دہلی) ۱۹۷۹ء، ص ۷۶ تا ۷۸۔

(۳) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی: مکتوبات سرسید ۱۸۴۹ تا ۱۸۹۸ (مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور) ۱۹۵۹ء، سرسید نے یہ خط جے آرنلڈ کو لکھا تھا، جہاں اس میں عیسائی اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے اعتراضات اور اختلاف کا ذکر ہے، وہیں دو بڑے مسلم علما کی طرف سے پذیرائی بھی ہے، جو اس وقت کے ماحول میں یہ ایک بڑی کامیابی بھی ہے، خاص طور سے اس بات کا تذکرہ کہ "تبیین الکلام ہر سہ شنبہ کو مسجد میں پڑھی جاتی تھی"۔

(۴) سرسید کی تصنیف اور تحریک برائے تفہیم بین المذاہب کی اہمیت اور مسلسل افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، ایک جدید بین الاقوامی عیسائی اسکالر Professor Hans Kung نے اپنی حالیہ کتاب Islam: Past, Present and Future, 2004 (انگریزی ترجمہ ۲۰۰۷) میں مندرجہ ذیل اشعار کو موجودہ دور میں کلید کامیابی قرار دیا ہے:

No Peace among the nations without
peace among the religions.
No Peace among the religions without
dialogue between religions.
No dialogue between religions without
investigation of the foundations of religions.

(۵) تفصیلات کے واسطے دیکھیے: Basil Willey: The Seventeenth -Century Background (1962) - Chapter 7.

ذہن اور دماغ کے مابین تعلق کی نوعیت

(ایک جائزہ)

ڈاکٹر خواجہ محمد سعید

یونانیوں کے ہاں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ روشنی انسانی آنکھ سے نکل کر جب کسی شے سے ٹکراتی ہے تو وہ شے انسان کو دکھائی دیتی ہے، ابن الہیثم پہلے مسلمان سائنس داں تھے جنہوں نے اس نظریے پر غور کیا، ایک دن وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے، ان کے سامنے ایک چوڑی گزرگاہ تھی جس کے اطراف میں درختوں کی قطار ایک ترتیب میں تھی، خاص بات یہ تھی کہ ان درختوں کی عمر اور اونچائی برابر تھی، جب ان کی نظر ان درختوں پر پڑی تو اس وقت ان کے ذہن میں کوئی دوسرا خیال موجود نہیں تھا، انہوں نے اپنی تمام تر توجہ ان درختوں پر مرکوز کی، اچانک ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور خوشی سے پھولے نہ سمائے، اس حیرت نے بصارت کے بارے میں ایک نئے قانون کو جنم دیا جو کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اپنی سچائی کے ساتھ قائم و دائم ہے، ان کا نظریہ یونانی نظریہ کے بالکل الٹ تھا کہ روشنی کسی شے سے ٹکراتی ہے اور وہاں سے منعکس ہو کر آنکھ تک پہنچتی ہے تو وہ شے ہمیں نظر آتی ہے، اگر روشنی آنکھ سے نکل کر کسی شے سے ٹکراتی ہے تو ہمیں تمام اشیا یکساں نظر آنی چاہیے تھیں جب کہ ان کا حجم اور سائز بھی برابر ہو اور وہ ایک ترتیب میں بھی ہوں لیکن عملاً ایسا نہیں ہوتا، انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ایک ہی قطار میں درختوں کو دیکھا جائے تو وہ درخت جو قطار میں پہلے ہوگا وہ سب سے بڑا نظر آئے گا، اسی طرح جو درخت سب سے آخر میں ہوگا وہ سب سے چھوٹا نظر آئے گا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روشنی ہماری آنکھ سے نہیں نکلتی بلکہ پہلے کسی شئے سے ٹکراتی ہے، پھر ہماری آنکھ میں داخل ہوتی

شعبہ فلسفہ جامعہ، پنجاب، لاہور۔

ے جس کی وجہ سے وہ شے نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے اشیا دور یا نزدیک ہونے کی وجہ سے ہمیں چھوٹی یا بڑی نظر آتی ہیں، ستاروں کا چھوٹا بڑا نظر آنا اس قانون کی تصدیق کرتا ہے، اسی طرح جب ہم گاڑی میں سفر کرتے ہیں تو چیزیں چھوٹی بڑی نظر آتی ہیں، یہ اعزاز ابن الہیثم کو حاصل ہے کہ انہوں نے بصارت کے بارے میں ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس کو موجودہ دور کی سائنس آج تک غلط ثابت نہیں کرسکی، بلکہ یورپ کی یونی ورسٹیوں میں آج بھی اس نظریے کی تدریس ہوتی ہے، ابن الہیثم سے بہت پہلے انسان درختوں اور سیاروں کو دیکھتا آرہا تھا، بلکہ علم نجوم ان سے بہت پہلے رواج پاچکا تھا لیکن کسی نے بھی اس بات غور نہیں کیا جو بات ابن الہیثم کے ذہن میں آئی، اس کی وجہ کیا تھی اگر اس سوال کا جواب ڈھونڈ لیا جائے تو کائنات کے بہت سے حقائق کے بارے میں معلوم کرنا آسان ہو جائے گا، بلکہ اس سے بہت سے مابعد الطبیعیاتی مسائل کا حل بھی ممکن ہو جائے گا، نوع انسانی کا ہر فرد ذہن رکھتا ہے، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اگر ذہن استعمال کرے تو بہت کچھ کرسکتا ہے، آخر یہ ذہن اور دماغ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا ایک سکے کے دو رخ ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے، ذہن انسان کو زندگی کے بارے میں خیالات، تصورات اور نظریات دیتا ہے جب کہ دماغ ان کو منزل کی طرف لے کر جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم عام گفتگو میں کسی کو ذہین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، دماغی کہہ کر مخاطب نہیں کرتے، اگرچہ یہ دونوں اپنا الگ الگ وجود رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، یہ ایک بڑا اہم سوال ہے کہ دماغ اور ذہن کے درمیانی واسطہ خیال کیا ہے؟ اور یہ کہاں سے آتا ہے؟ ان دونوں کے درمیان تعلق کے بارے میں تمام مکاتب فکر نے اپنے اپنے علم کے مطابق غور و فکر کیا، مثلاً فلسفہ، نفسیات، پیراسائیکالوجی، مابعد الطبیعیات کے علاوہ دوسرے علوم نے بھی اپنے اپنے انداز میں ان کے تعلق کے بارے میں بحث کی، ماہرین روحانیت نے بھی اس مسئلہ پر غور و فکر کیا، اگرچہ اس کے بارے میں مختلف علوم میں مختلف اصطلاحات استعمال ہوئیں یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا انداز بیان مختلف ہے، اس وقت تک ان دونوں کے بارے میں جتنی بھی تحقیق ہوئی ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ دماغ ایک مادی اور ظاہری عضو ہے جب کہ ذہن ایک مابعد الطبیعیاتی عنصر ہے یا ایک باطنی رخ ہے، اگر ہم تاریخی تسلسل میں دیکھیں تو ذہن زندگی کے

ساتھ ساتھ ہے جیسا کہ زمین پر زندگی اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک غیر نامیاتی مادہ صورت اختیار نہیں کرتا، اسی طرح ذہن بھی اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوسکتا جب تک نامیاتی مادہ جس میں حسی اعضا، دماغ اور نروز (Nerves) وغیرہ صورت اختیار نہ کریں، تجربات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے سامنے تین چیزیں ہیں، مادہ، زندگی اور ذہن، زندہ اشیا اور غیر جاندار اشیا میں واضح فرق ہے، ہمیں اپنے حواس سے جن بھی اشیا کا علم ہوتا ہے، تقریباً وہ سب مادہ کی صورت میں ہیں لیکن اس کائنات میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو مادی طور پر اپنا وجود نہیں رکھتیں مگر ان کے وجود سے انکار بھی ممکن نہیں، مثلاً ہمارے احساسات، جذبات، حقائق، ذہن، یادداشت، فکر وغیرہ، چنانچہ جب ہم شور سنتے ہیں تو اس سے دماغ میں Sensation Auditory پیدا ہوتی ہے جس سے کان میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور یہ ارتعاش دماغ تک پہنچتا ہے جس سے سننے کا عمل واقع ہوتا ہے، یہ سارا عمل سکینڈ کے کچھ حصے میں ہوتا ہے لیکن جب یہ ارتعاش دماغ کے ایک مخصوص حصہ میں پہنچتا ہے تو ایک نیا اور انوکھا عمل رونما ہوتا ہے، یہ Auditor Sensation دراصل Mental Event ہے نہ کہ کوئی طبیعی عمل ہے، یہ ایک Awareness یا شعوری کیفیت ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ذائقہ، حرارت، درد وغیرہ شعوری کیفیات ہیں، اس کو ایک مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے، جب ہم گھنٹی کی آواز سنتے ہیں تو یہ آواز ہمارے کان اور گھنٹی کے درمیان کسی نہ کسی جگہ لہروں کی صورت میں موجود ہوتی ہے جس سے ہمارے دماغ میں ایک Sensation پیدا ہوتی ہے، یہ Sensation کیا ہے، کیا کوئی سرجن دماغ کا آپریشن کرکے اس کو دماغ کے کسی حصے میں دیکھ سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر اس کو کسی زمان ومکان میں مقید نہیں کیا جاسکتا ہے، طبیعی اور ذہنی عوامل میں تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ اس بارے میں مختلف نظریات ہیں، Behaviourism کے مطابق ذہنی زندگی کا انحصار طبیعی صورت حال پر ہے اور وہ اس کے بغیر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی، اس کے برعکس Phychophysical Paralleism کے نظریے کے مطابق ذہن اور مادہ میں کوئی علتی رشتہ نہیں ہے، یہ مختلف وقوعات ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی ایک دوسرے کو چھوئے بغیر عمل کرتے ہیں، مثلاً خوراک کا ہضم ہونا ایک طبیعی عمل ہے، اس کا ذہنی عمل پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جب کہ Epiphenomenalism کے مطابق

ذہن کچھ بھی نہیں، چنانچہ اس کا تعلق جسم کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ جسم کے ساتھ اس کے سائے کا ہے، انسان کی حرکت کے ساتھ اس کا سایہ بھی حرکت کرتا ہے یعنی جسم کی حرکت سائے کی حرکت کا سبب ہے نہ کہ سایہ جسم کی حرکت کا سبب بنتا ہے، اس کے علاوہ The Double Aspect-Theory کے مطابق طبیعی اور ذہنی عوامل ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔(۱)

یونانی فلسفی ارسطو کا نام تاریخ فلسفہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، ارسطو نے ذہن کی تشریح میں بھی اہم کردار ادا کیا، اس کا خیال تھا زندگی کی حرکت کا اصل سبب نیوما (Numa) ہے، جو انسانی جسم میں کرنٹ کی مانند حرکت کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے خیالات اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں، انسانی جسم کے نظام کو چلانے کے لیے یہ پوشیدہ طاقت دل کے مقام پر اپنے احکامات صادر کرتی ہے اور اس طرح خیالات پیدا ہوتے ہیں، یہ خیالات اس وقت عمل کرتے ہیں جب دماغ کے اندر کچھ کیمیائی عمل ہوتا ہے اور اس کیمیائی عمل کے ذریعے دماغ ان خیالات کو معنی پہنا کر جسم کے حوالے کرتا ہے اور اس طرح انسانی جسم کے اعضا کے وسیلہ سے ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے، ارسطو کا یہ نظریہ صوفیا کے نظریہ روح کے قریب تر ہے، یونان کے بعض مفکرین کے نزدیک جسم روح کی تین اقسام کے تحت کام کرتا ہے، اس میں سب سے پہلے فطری روح ہے جس کا مقام جگر ہے، دوسری حیاتی روح ہے جس کا مقام بائیں وینٹیریکل ہے جب کہ تیسری روح حیوانی روح ہے جس کا مقام دل ہے، دماغ کے نچلے حصے میں روشنی کا ایک عجیب وغریب نٹ ورک ہے جسے باریک بینی سے حیوانات میں دیکھا جاسکتا ہے، اس نظریہ کو سترہویں صدی میں بڑی مقبولیت حاصل رہی، برطانوی سرجن سر چارلس بیل اپنی کتاب The Nervous System of The Human Body میں لکھتا ہے کہ:

> ”قدیم لوگوں کا یہ نظریہ تھا کہ دماغ سے ایک عصبی مائع نکلتا ہے جو عصبی نالیوں سے منسلک ہوتا ہے، موجودہ دور کے عصبی ریشوں کا سائنسی نظریہ اس قدیم نظریے سے کتنا مماثل ہے، اس عصبی رابطے کے راستے ”ذات“ کے خیالات اور پیغامات عصبی اعضا کو منتقل ہو جاتے ہیں“۔

فلاسفہ کے علاوہ اہل مذاہب نے بھی ذہن کے بارے میں بحث کی اور اس سوال کی

وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خیال کہاں سے آتا ہے؟ اس کے لیے ہندومت کے نظریات کا جائزہ لینا دل چسپی سے خالی نہیں ہے، قدیم ہندو مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہمارے جسم کی حرکت کا سبب کوئی خارجی وجود ہے، ان کا خیال تھا، اس کائنات میں ایک ہی روح کارفرما ہے، جس کو وہ ''برہما'' کا نام دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ یہ ایک آزاد اور خود مختار روح ہے جو انسانی زندگی کو سہارا دیتی ہے، مہاتما گوتم بدھ کا نظریہ ''نروان'' بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ انسانی دماغ یا جسم کا تعلق کسی مابعد الطبیعیاتی منبع سے قائم ہے جہاں سے آنے والی انسپائریشن (Inspiration) زندگی کی تحریک کرتی ہے، اسی طرح جب ہم قدیم جاپانی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلیمات میں انسان دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک حصہ ''اوموٹ'' اور دوسرا ''یورا'' ہے، ڈاوٹا کیومی نامی کتاب کے مطابق اوموٹ کا مطلب ''بیرونی خیالات'' اور یورا کا مطلب ''انتہائی اندرونی'' خیالات ہیں، اصل میں یہ شعور کے دو پہلو کو اجاگر کرتے ہیں یعنی ''یورا'' سے مراد شعور ہے جب کہ ''اوموٹ'' سے مراد لاشعور یا ذہن یا روح ہے، جاپانیوں نے یہ تقسیم شنٹو مذہب سے لی ہے، اسی طرح شکی شین فونی کا بدھ تصور بھی بہت اہم خیالات کا اظہار کرتا ہے، ''شکی'' سے مراد زندگی کے تمام سائنسی یا طبعی مظاہر یا دوسرے الفاظ میں شکی دراصل زندگی کا مادی پہلو ہے جس کو ہم شعور کہہ سکتے ہیں، ''شین'' زندگی کے روحانی وظائف کی جانب اشارہ کرتا ہے، ''فونی'' کے معنی ناقابل تقسیم ہیں یعنی یہ حصہ زندگی کے ناقابل تقسیم ہونے کی وضاحت کرتا ہے جسے اندرونی کرنٹ بھی کہا جاتا ہے، یہ دراصل تین نظریات ہیں جن کو ایک جگہ یکجا کیا گیا ہے یعنی شیک شعور، شین لاشعور اور فونی اللہ رب العزت کی تشریح ہے، ذہن یا روح کے بارے میں یہ بحث صدیوں پر محیط ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں، اس کی سب سے بڑی وجہ فلاسفہ اور علمائے فطرت کی مختلف اصطلاحات اور اس کے ساتھ زبانوں کی تبدیلی ہے، ایک ہی حقیقت کو جاپانی یورا، ہندو ''برہما''، بدھ ''نروان''، فلسفہ ''لاشعور یا ذہن'' اور صوفیا ''روح'' کہتے ہیں، یہ اختلاف آج بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا، جب تک ہم ان الفاظ کے گرداب سے نکل کر ان کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے، یہ اختلاف جاری و ساری رہے گا۔ (۲)

مشہور فرانسیسی فلسفی اور ریاضی داں دیکارت نے خیال کے بارے میں ایک سائنسی انداز اپنایا، اس کا خیال تھا کہ ذہن اور جسم بنیادی طور پر دو مختلف جواہر ہیں، جسم کی صفت امتداد جب کہ ذہن کی صفت فکر ہے، اس کے نزدیک جسم منفعل جب کہ ذہن ہمیشہ فعال ہے اور اپنی آزاد حیثیت رکھتا ہے، دونوں جواہر ایک دوسرے سے متخالف اور متغائر ہیں (۳)، ان کے نظریے کے مطابق ذہن کو زمان ومکان میں مقید نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ جگہ گھیرتا ہے جب کہ جسم کو سوچنے کی صلاحیت میسر نہیں، کسی کو گولی سے زخمی کیا جاسکتا ہے مگر اس کے احساسات کو مجروح نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اپنی ذات کا جو احساس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے ہم ذی شعور ہیں، ہم بغیر جسم کے اپنی نوعیت کو برقرار رکھتے ہیں مگر ذہن کے بغیر یہ ناممکن ہے، دیکارت نے فکر کو وسیع معنوں میں استعمال کیا، اس کا خیال تھا کہ اس کے معانی ادارک، تخیل، ارادے اور احساس کے ہیں، فکر کو اپنے وجود کے لیے کسی محل یا جوہر کی ضرورت ہے اور یہ جوہر ذہن ہی ہے جس میں فکر اپنا مستقل وجود رکھ سکتی ہے، اس کے اس نظریے کے مطابق جس طرح جسم کی بنیادی صفت امتداد ہے، اس سے دوسری صفات یعنی سائز، حجم وغیرہ کو اخذ کیا جاتا ہے، اسی طرح ذہن کی بنیادی صفت فکر ہے جس سے ارادہ، احساس اور ادراک وغیرہ جیسے ذہنی عوامل بھی فکر سے صادر ہوتے ہیں، اس کا خیال تھا کہ روح اور جسم کے درمیان ایک علت کا رشتہ ہے، روح جسم میں موجود پائنیل غدود میں قیام کرتی ہے جہاں تحسسات موصول ہوتے ہیں اور ان کو جسم کے عضلات اور اعصاب تک منتقل کیا جاتا ہے، یوں روح اور جسم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس طرح انسانی شخصیت ایک ناقابل تقسیم وحدت بن جاتی ہے۔

اے۔ جے۔ ایئر نے روح اور جسم کے تعلق کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ذہن اور جسم کے درمیان ہماری قائم کردہ تخصیص جب تک باقی رہے گی، یہ مسئلہ باقی رہے گا''، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ذہن و مادہ مختلف ہستیاں نہیں جن کے درمیان ہمیں رابطہ کے لیے ایک ''پل'' وضع کرنا ہے یا دریافت کرنا ہے، ذہن کے بارے میں بات کرنا اور جسم کے بارے میں بات کرنا دراصل اپنے تجربات کی

جماعت بندی اور تشریح و تعبیر کرنے کے مترادف ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ اس عمل سے دقیق فلسفیانہ مسائل پیدا نہیں ہوتے، ایسے مسائل پیدا ہونا ناگزیر ہے، مثلاً ہم دوسروں کے خیالات و افکار کا تجزیہ کیسے کر سکتے ہیں؟ یا یہ کہ لوگوں کے خیالات و افکار کے بارے میں جملے ان کے قابل مشاہدہ کردار سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں وغیرہ (یہ علاحدہ نوعیت کے مسائل ہیں) لیکن ڈیکارٹ کی قائم کردہ ذہن و جسم کی دو مختلف جواہر کی حیثیت سے تخصیص کو ختم کر دیں تو پھر ہمیں ذہنی اور جسمانی اعمال کے تعامل کی تشریح کرتے ہوئے کوئی الجھن نہیں ہوگی''۔(۴)

مسلمان مفکرین میں الفارابی فلسفہ، سیاسیات اور سائنسی علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفیانہ فکر کے بھی حامل تھے، انہوں نے خیال، تصور اور احساس کی وضاحت بڑے خوب صورت انداز میں کی ہے، مغربی مورخ اور فلسفی آر ہیمنڈ اپنی کتاب "The Philosophy of Alfarabi and its influence on Medieval Thought" میں لکھتا ہے کہ الفارابی میں فلسفہ سے زیادہ صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے، الفارابی کے نزدیک کائناتی حقیقت کی بنیاد اللہ رب العزت کی ذات ہے، باقی تمام اشیا کی حیثیت ثانوی ہے، ان کا یہ نظریہ بڑا اشفاف اور سائنٹفک ہے اور ان سے قبل کے تمام نظریات کی نفی کرتا ہے، ان کے نزدیک احساس اللہ رب العزت کا بھیجا ہوا انسپائریشن ہے جو اس مادی جسم سے ہوتا ہوا گزرتا ہے لیکن اس کے عمل کا پروسس کیا ہوتا ہے؟ احساس کتنے یونٹوں سے کس طرح سے ہو کر ہمارے دماغ تک پہنچتا ہے؟ اور دماغ اسے کس طرح جسم میں منتقل کرتا ہے، اس بارے میں فارابی نے کوئی جواب نہیں دیا، پی۔ کے۔ ہٹی نے اپنی کتاب "History of Arabs" میں ایک اور مسلمان مفکر الکندی کا ایک ایک قول نقل کیا ہے جس میں انہوں نے خیال کے ماخذ کی وضاحت کی ہے:

''انسان میں ایک ذہن کام کر رہا ہے اور انسانی روح اسی ذہن کی وجہ سے (زمانہ ازل میں) متحرک اور متفرق ہوئی تھی''۔

الکندی نے بھی فارابی ہی کی بات کو آگے بڑھایا ہے، ان کا بھی یہ خیال تھا کہ ذہن اللہ رب العزت کی ہی ذات سے پیغامات کے حصول کا ذریعہ ہے اور اللہ رب العزت نے ہی روح انسانی

…ریک دی جس کی وجہ سے زندگی معرض وجود میں آئی، اسلامی فکر میں ایک اہم نام بوعلی سینا کا بھی ہے، پی۔ کے۔ ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف عربس میں اس سلسلے میں ان کا بھی ایک قول نقل کیا ہے:

''ظاہری حواس ثانوی حیثیت کے حامل ہیں، بنیادی طور پر نوعی تقسیم دراصل باطنی حواس پر مبنی ہے جو سب میں موجود ہوتی ہے، کائنات کے تمام ارکان ایک جوہر (روح) رکھتے ہیں''۔

ابن سینا ظاہری حواس کو ثانوی حیثیت اور باطنی حواس کو اصل قرار دیتے ہیں لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا باطنی حواس کو ذہن قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان کی اس بات سے ہم صرف یہ جان سکتے ہیں، انہوں نے حواس ظاہری و باطنی کے منبع کو جوہر (روح) قرار دیا ہے، ان کے اس نظریے کی تصدیق سینٹ تھامس ایکونیاس سے بھی ہوتی ہے جو بنیادی طور پر صوفیانہ ذہن کا مالک تھا اور ذہن اور جسم کو ایک ہی تصور کرتا تھا، اپنے ایک بیان میں کہتا ہے کہ:

''چوں کہ انسانی روح ایک ماورائی قوت ہے، اس لیے یہ موت تک جسم کو زندہ رکھتی ہے، روح مادی اشیا سے تخلیق نہیں ہوتی ہے اور یہ ہر قسم کی خطاؤں اور جرائم سے پاک ہے، جب آدمی اپنے جسمانی حواس پر بھروسہ کرتا ہے تو روح متفرق یا منتشر خیالات اسے مہیا کرتی ہے، انسانی صلاحیتیں روح کے تین تنزلات پر مشتمل ہیں، ایک نباتاتی روح جس میں نشو و نما اور تولید کی قوتیں زیر بحث آتی ہیں، دوسری حیاتی روح جس میں حیاتی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے اور تیسری وجدانی روح جس میں تمام روحانی صلاحیتیں زیر بحث آتی ہیں''۔(۵)

تھامس ایکونیاس نے انسانی جسم کو اللہ رب العزت کا الہام قرار دیا، اس کا خیال تھا کہ تمام انسانی صلاحیتیں روح کے تابع ہیں اور اللہ رب العزت کی مدد کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔

روح اور جسم کے درمیان تعلق کے بارے میں اہل فلسفہ، سائنس دانوں اور دوسرے ارباب کمال نے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے، البتہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نئی نئی ایجادات اور …انتوں کے لیے سرگرم عمل ہوا اور فطری طور پر مادیت پرستی کی وجہ سے نظریات میں بھی تبدیلی

آئی، مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے جس تشدد سے کام لیا اس نے جدید علوم کے حامل
انسان کو مذہب سے بیگانہ کردیا، یہ کوتاہی مذہب کی نہیں بلکہ مذہب کے ماننے والوں کی ہے
جنھوں نے مذہب کی تشریح اس طرح نہیں کی جس طرح اس کا حق تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس
اور جدید ذہن کے حامل لوگوں نے روح کی بحث کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اس سے مذہب کی بو آتی
ہے، جب ان کو جسم اور دماغ کو اطلاعات دینے والے ماخذ کے نام سے مشکل پیش آئی تو انھوں
نے اس کا نام ذہن رکھ لیا، ڈارون نے جب نظریہ ارتقا پیش کیا تو اس نے جدید ذہن کے لیے
گمراہی کی ایک اور راہ ہموار کردی۔

یہ طبقہ اس مفروضے کے پیچھے چل پڑا اور ان کا کہنا تھا کہ تخلیق ایک اتفاقی عمل ہے اور
انسان کی ابتدا ایک خلوی جاندار سے ہوتی ہے، اس نظریے نے جدید ذہن سے مذہب کو چھین لیا اور
ساتھ ہی روح کو بھی علوم سے الگ کردیا، یوں ذہن اور دماغ کے بارے میں دو نظریات نے جنم لیا:
۱- مادی یا نیچری انداز فکر۔ ۲- روحانی یا ذہنی انداز فکر۔

مادی نظریہ ڈارون کے نظریہ ارتقا کی ہی دوسری شکل ہے جس کے مطابق دماغ
ہزاروں سالوں سے ارتقا پذیر تھا جو اب ترقی یافتہ شکل اختیار کرگیا ہے، اب دماغ اندرونی
احساسات ذہانت اور زندگی کو باربط بنانے کا اہل ہوا ہے، اس نظریے کے مطابق عصبی خلیوں یعنی
نیورانز کی وجہ سے زندگی کی حرکت، خیالات، جذبات اور تصورات کی داغ بیل پڑتی ہے،
ماہرین کا خیال ہے دماغ کے ان نیورانز کی وجہ سے ایک خاص قسم کا میکانزم پیدا ہوتا ہے، جس کی
وجہ سے خصوصی ذہنی حالت تخلیق ہوئی ہے، دماغ کے سیریبلم یونٹ کی تخلیق یعنی خیالات،
جذبات کے بننے کے عمل کی یہ تشریح درست حقائق پیش نہیں کرتی اور ماخذ محض احساسات، خیالات
اور جذبات کے گرد گھومتے رہتے ہیں، نہ ہی یہ نظریہ ذہن کی وضاحت کرپاتا ہے نہ اس کی کہ
خیال دماغ کے پاس کہاں سے آتا ہے؟ یہ طبقہ ذہنی تحریکات کو دماغ کی جز ترکیبی، ابتدائی رسائی
یا محدود گنجائش یا استعداد ہی سے ثابت کرتا ہے جب کہ اگر ہم ان نظریات سے دو سو سال پیچھے
چلے جائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس پرانے دور میں دماغ کی استعداد اور تحریکات کے بارے
میں واضح خیالات پائے جاتے تھے، مثلاً امانویل کانٹ اور ڈیکارٹ کے خیالات اس خود ساختہ

نظریے سے کہیں زیادہ بہتر اور قابل فہم نظر آتے ہیں، ۱۹۱۳ء میں جان واٹسن نامی سائنس داں
نے اس نظریے پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ انسانی نفسیات کا درست تصور شعور اور باطنی آگاہی کی
تکنیک کے بغیر قابل تذکرہ نہیں ہوسکتی لیکن لوگ انسانی نفسیات کو بلیوں، بندروں اور چوہوں پر
تجربات کرکے مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں، دوسرا نظریہ روحانی ہے جو اس بات کی وضاحت کرتا ہے
کہ دماغ ذہن کا ڈیٹکٹر (شناسندہ) ہے جو ذہن سے زندگی گزارنے کے متعلق خیالات،
تصورات اور جذبات قبول کرتا ہے، اس نظریے کے مطابق ذہن باطنی زندگی کا ابتدائی درجہ ہے،
جب کہ خیالات کا آنا دوسرا درجہ ہے، شعور کا تعلق لامحدود اور غیر مادی روح کے اوپر ہوتا ہے جو
شعور کی تعمیر کرتی ہے، سر چارلس شیرنگٹن اور سر جان ایکلس نے دماغی یونٹوں کی خصوصی تحقیق کے
بعد روحانی زندگی سے اس کے منسلک ہونے کی تصدیق کی ہے۔

بیسویں صدی میں پیرا سائیکالوجی نے انسانی ذہن کو مادیت کی گرفت سے نکالا اور
سائنس دانوں نے بھی ذہن کی ماورائے حواس قوتوں پر تحقیق کا آغاز کیا، تاریخ اس بات کی گواہ
ہے کہ انسانی ذہن ایسی لامحدود قوتوں کا مالک رہا ہے، جن کی جسمانی حواس سے تشریح ممکن نہیں،
مثلاً ٹیلی پیتھی کے حوالے سے سائنس خاموش ہے لیکن ہر انسان کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی ٹیلی پیتھی
سے واسطہ ضرور پڑتا ہے، کبھی ذہن میں کسی دوست کا خیال آتا ہے اور وہ آپہنچتا ہے، کسی زبان سے
کوئی لفظ ادا ہونے سے پہلے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے یا بعض اوقات انسان کو ایسے
خواب آتے ہیں جن میں موجود حقائق اس انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر جوزف
نے "E.S.P" (Extera Sensory Percepation) ٹیسٹ کیے اور ایک لمبی فہرست تیار کی اور
یہ ثابت کیا کہ کسی مخفی طاقت کے ذریعہ دماغ اپنے افعال سرانجام دیتا ہے اور اس طرح احساس یا
خیال دماغ کو منتقل ہوتا ہے، اس کے بعد ماہرین اس بات پر متفق ہوگئے کہ یہ محض خیال خام نہیں
کہ جسم و دماغ کو کوئی دوسری طاقت کنٹرول کرتی ہے، اس طاقت کو ماہرین نے ذہن کا نام دیا،
۱۹۲۴ء میں پہلی بار ماہرین کو معلوم ہوا کہ دماغ میں برقی کرنٹ کا بھی عمل دخل ہے، چنانچہ اس
کرنٹ کو ناپنے کے لیے ایک آلہ ایجاد ہوا جس کا نام "Electro Encephalogram" (E.E.G)
رکھا گیا، اس آلہ سے انسانی دماغ میں چار ماورائی لہروں کی موجودگی کا پتہ چلا، یہ ماورائی لہریں

کہاں سے آتی ہیں، یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو ذہن اور دماغ کے مابین تعلق کی نوعیت کو معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

اس ساری بحث سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سارا عمل مادی کے بجائے روحانی ہے اور علوم روحانی کے لیے ہمیں قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، قرآن پاک میں قلب کے معنی فکر کے ہیں، جس طرح انسان آنکھوں سے اس طبیعی کائنات کو دیکھتا ہے اسی طرح قلب کی آنکھ فکر ہے، یہ فکر کہاں سے آتی ہے اس کے بارے (قرآن پاک) میں اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶)

اللہ نور ہے زمین اور آسمانوں کا۔

اسی طرح فرماتا ہے کہ:

وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۷)

اس کی کرسی سمائے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو۔

ان دو آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ذہن کے بارے میں بحث کی جائے تو ذہن اور دماغ کے مابین تعلق کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے، پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کا نور کائنات کے ذرے ذرے میں ہے، یہ نور اپنے اندر علم بھی لیے ہوئے ہے، دوسری آیت میں علم کو واضح کر دیا ہے، یہ نورانی لہریں ہر انسان کے پاس آتی ہیں ان کو جذب کرنے کی صلاحیت مختلف اجسام میں مختلف ہے، وحی کی دو اقسام ہیں، ایک وحی جلی اور دوسری وحی خفی، وحی جلی کا سلسلہ نبی پاکؐ پر آکر ختم ہو گیا، اب تا قیامت کوئی نبی نہیں آئے گا، یہ بات ہمارے ایمان کے جزء لازم کی حیثیت رکھتی ہے لیکن وحی خفی کا سلسلہ اس کائنات میں اللہ کی نورانی لہروں کی صورت میں جاری و ساری ہے، یہ علم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور یہی ذہن ہے جو دماغ کو متحرک کرتا ہے، ٹرائن اپنی کتاب "In Tune with the Infinite" میں لکھتا ہے کہ:

"We can bring our minds such harmony with Divine power that it directs, illimines and energies us. To act under the guidence of this higher wisdom we become the channel through which the Infinite manifest himself. There is a power which when adequately

realised and used, will lift up and intensify the individual life, and when it becomes the controlling impulse it will remould our human relations, national and international" (۸)

"ہم خدائی طاقت کے ساتھ وہ تعلق اور ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے، ہدایت، نور اور قوت کا سرچشمہ بن جائے، اس دانش اعلا سے متاثر ہونے کے بعد ہم خدائے حی و قیوم کی صفات کا مظہر بن جاتے ہیں، کائنات میں ایک ایسی توانائی موجود ہے کہ اگر اسے حاصل کرنے کے بعد اس کا صحیح استعمال کریں تو اس سے ہماری ہستی میں وسعت و رفعت پیدا ہو جائے گی اور اگر یہی قوت ہماری محرک و رہبر ہو تو ہمارے قومی و بین الاقوامی تعلقات نئی بنیادوں پر استوار ہو جائیں گے"۔

قرآن پاک میں اسی حوالے سے ایک آیت ہے جو ہمارے اس موقف کی مزید وضاحت کرتی ہے، ارشاد ربانی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹)

مومنو! خدا سے ڈرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دگنا اجر عطا فرمائے گا اور تمہارے لیے روشنی کر دے گا جس میں چلو گے اور تم کو بخش دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ کے نور والا علم نہ تو کسی زمینی کتاب میں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی باقاعدہ تعلیم کسی مدرسے، اسکول یا یونی ورسٹی میں ہوتی ہے بلکہ اس کے دھارے روح سے پھوٹتے ہیں، روح ان نورانی لہروں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، بشرطیکہ اس میں ہمارے اعمال کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہ ہو، روح کی آنکھ وجدان ہے، جس طرح دھند سورج کی روشنی کو غائب کر دیتی ہے اسی طرح ہمارے برے اعمال فکر کی عینک کے سامنے دھند بن کر چھا جاتے ہیں اور روح اندھی ہو جاتی ہے، قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَائِمًا يَّحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ (۱۰)

بھلا مشرک اچھا ہے یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا اور آخرت سے ڈرتا اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتا ہے، کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے (یعنی جو ان صفات سے محروم ہیں) دونوں برابر ہو سکتے ہیں اور نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جو عقل مند ہیں۔

اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ملتا ہے، ایک علم اور دوسری عبادت، علم سے انسان کو ایسی قوت ملتی ہے، جس سے وہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے جب کہ عبادت وہ توانائی ہے جو زماں و مکاں کی تمام حدود و قیود کو توڑ کر اللہ رب العزت کے جوار میں پہنچ سکتی ہے اور اس کو اسرار غیب نظر آنے لگتے ہیں، علم سے دماغ کو اور عبادت سے روح (ذہن) کو نور عطا ہوتا ہے۔

اس کائنات میں ایک عظیم دماغ کام کر رہا ہے، جس سے ایسی لہریں پیدا ہوتی ہیں کہ وہ اس کائنات میں پائی جانے والی ہر شے پر اثر انداز ہوتی ہیں، جب ان لہروں کا ٹکراؤ مختلف دماغوں سے ہوتا ہے تو ان کے اندر تحریک پیدا کرتی ہیں، یوں کسی دماغ میں تجویز، کسی میں ارادہ، کسی میں خیال اور کسی میں اضطراب پیدا ہوتا ہے، یہ عظیم دماغ حیات کائنات ہے یعنی یہ اللہ رب العزت کی نورانی لہریں ہیں جو اس کائنات کو حیات بخشتی ہیں، خود مادہ کسی ٹھوس و جامد شے کا نام نہیں بلکہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطابق یہ مادہ لطیف سے لطیف تر ہوتے ہوئے توانائی (نورانی لہروں) میں تبدیل ہوتا ہے، کیوں کہ اللہ رب العزت کی نورانی لہریں ہر ہر ذرہ میں موجود ہیں، سائنس بھی اب اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ ہماری مادی کائنات کے علاوہ ایک اور غیر مادی کائنات بھی ہے، جہاں تک سائنس کی رسائی ممکن نہیں، جس طرح جب ہماری نظر کسی درخت پر پڑتی ہے تو ہمیں اس کے پتے اور شاخیں نظر آتی ہیں لیکن ہم اس کی جڑوں کو نہیں دیکھ سکتے، حالانکہ وہ اپنا وجود رکھتی ہیں اور پتوں اور شاخوں کا وجود ان کے وجود پر منحصر ہے، اگر جڑیں خشک ہو جائیں تو پتوں اور شاخوں کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے، اس مادی اور روحانی کائنات کے درمیان فرق کو

قرآن پاک نے خلق اور امر کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے، اسی طرح سائنس جب ایتھر کی بات کرتی ہے تو اس وقت سائنس مادہ کی دنیا سے باہر نکل کر روحانی دنیا کی بات کرتی ہے، اسی حوالے سے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ:

”ایٹم کا جوہر، اس کی ہستی سے وابستہ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہستی وہ خصوصیت ہے جو خدا کی طرف سے ایٹم کو عطا ہوتی ہے، اس خصوصیت کی موہبت سے پہلے ایٹم خدا کی تخلیقی توانائی میں بے جان پڑا رہتا ہے اور اس کی ہستی سے مفہوم صرف اس قدر ہے کہ یزدانی توانائی نے مرئی شکل اختیار کر لی...... یہ کائنات اپنی تمام تفاصیل کے ساتھ مادی ایٹم کی میکانکی حرکت سے لے کر نفس انسانی میں فکر کی آزاد حرکت تک سب کا سب کیا ہے، اس ”انائے اکبر“ کا انکشاف ذات“۔(۱۱)

اقبال نے آنکھ کے نور اور دل کے نور میں فرق کیا ہے:

دل بینا تو کر خدا سے طلب   آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ:

”اس کشف کا راز دراصل یہ ہے کہ روح جب حس ظاہر کو چھوڑ کر حس باطن کی طرف رجوع کرتی ہے تو ظاہر ہے کہ حس کمزور پڑ جاتی ہے اور روح قوت پکڑتی جاتی ہے اور روح میں جان سی پڑ کر اس سے قوت دوبالا ہو جاتی ہے، جب اس میں بیداری آتی ہے تو وہ ذکر و شغل میں اور مدد دیتی ہے، کیوں کہ پھر یہی ذکر اس کے لیے غذا کا کام دیتا ہے، جس سے اس کا نشو و نما ہوتا ہے اور وہ روز بڑھتی پلتی رہتی ہے، تا آنکہ وہ درجہ نصیب ہوتا ہے کہ علم شہود کے درجہ میں آجاتا ہے، جو کچھ پہلے جانا جاتا تھا اب نظر آنے لگتا ہے، جس سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور نفس مکمل ہو کر عین ادراک بن جاتا ہے، مواہب ربانیہ اور علوم لدنیہ اور معرفت الٰہی کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اس وقت نفس عالم بالا عالم ملائکہ میں پہنچ کر ذات الٰہی کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے، چنانچہ اس طرح کا کشف صوفیا کو مجاہدہ و مراقبہ

سے اکثر و بیشتر حاصل ہو جاتا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ عالم وجود کے ان حقائق تک رسائی پالیتے ہیں، جن کا پتہ دوسروں کو نہیں لگ سکتا اور قبل از وقوع واقعات کا پتہ چلا لیتے ہیں اور اپنے نفوس کی طاقت وہمت کے مطابق موجودات سفلیہ میں تصرف کرنے لگتے ہیں مگر اولیائے کبار اس قسم کے کشف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور وہ تصرف فی الموجودات سے بھی دست کش رہتے ہیں اور جب تک ذات باری سے ان کو اشارہ نہ مل جائے کسی چیز کی حقیقت کے بارے میں زبان نہیں کھولتے، بلکہ اگر اچانک ان کے منہ سے کوئی غیبی بات نکل جائے تو توبہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں، چنانچہ صحابہ کرامؓ اسی نوعیت کے مجاہدہ پر کاربند تھے، وہ کرامت کے بلند درجہ پر فائز تھے لیکن غیب کے بارے میں لب کشائی کو برا جانتے تھے، آپ خلفائے اربعہ کے حالات میں کرامت کے اثرات روز روشن کی طرح عیاں پائیں گے، ان کے بعد صوفیا کا بہت بڑا طبقہ اسی رنگ پر قائم رہا جن کا ذکر خیر رسالہ قشیری میں بسط کے ساتھ آیا ہے''۔ (۱۲)

ڈیکارٹ جب کہتا کہ "I am, I Exist, I can exist without a body because I am a thinking thing" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اصل وجود ہمارا فکر ہے اور یہ ہے کہ مادی اجسام اور ذہن یعنی فکر دو الگ وجود ہیں، البتہ ایک دوسرے کے افعال کو متاثر ضرور کرتے ہیں، جب کبھی ہمارا پاؤں آگ پر پڑتا ہے تو ہم فوراً اپنے پاؤں کو اٹھا لیتے ہیں، سائنس کے مطابق یہ Reflex Action ہے مگر ایسا نہیں ہے بلکہ آگ نے ایک Sensation پیدا کی، اس کا تعلق ذہن سے ہے نہ کہ دماغ سے، اس کا فرق یوں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات ہمارے جوتے کا تسمہ کھل جاتا ہے اور ہماری آنکھ اسے دیکھتی ہے اور اس پیغام کو دماغ تک پہنچتی ہے اور اپنے پاؤں کو اوپر اٹھا کر اسے باندھ لیتے ہیں لیکن بعض اوقات ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ اگر جلدی میں ہوں تو ہم اس کام کو بعد کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، یہ سارے پیغامات ہمیں دماغ سے موصول ہوتے ہیں نہ کہ ذہن سے، اس مثال سے ذہن اور دماغ کے درمیان فرق کی وضاحت ہو جاتی ہے، آخر میں پروفیسر ولیم جیمز کا ایک اقتباس درج کر دیتا ہوں جو ہمارے اس خیال کی مزید وضاحت کرتا ہے:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا سے پرے بھی ایک دنیا ہے، جس کی سرحدیں اس مادی دنیا سے ملی ہوئی ہیں، ہمارے بلند مقاصد و تحریکات وہیں سے آتی ہیں، ہماری زندگی اسی سے متاثر ہوتی ہے اور یہ تاثر ہمارے اعمال و افکار میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے، مذاہب اس فوق الفطرت سرچشمہ کو خدا کہتے ہیں، خدا ایسی ہستی ہے جو ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے، اگر آسمانوں میں کوئی ایسا خدا موجود ہے جو ہمارے شخصی معاملات سے بے نیاز ہے تو بے کار ہے اور ہمیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں''۔ (۱۳)

شہد کی مکھی کس طرح اپنا چھتہ تیار کرتی، پھر اس میں شہد بھرتی ہے، اگر ہم اس چھتے میں بنے ہوئے سوراخوں کا عمیق جائزہ لیں تو انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، اس کے چھ کونے ہوتے ہیں، ان کے درمیان کا فاصلہ برابر ہوتا ہے، دنیا کا بڑے سے بڑا انجینئر بھی اس سائز کے سوراخ کو اس سائز میں برابر نہیں رکھ سکتا جس طرح شہد کی مکھی اس کے سائز و حجم کو برابر کرتی ہے، مکھی کو یہ فن کس نے سکھایا؟ قرآن پاک کہتا ہے کہ وَ اَوْحَیْنَا اِلَی النَّحْلِ کہ اللہ رب العزت نے بہ ذریعہ وحی اسے اس ہنر کی تعلیم دی، یہ وحی کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے جسم کو دو آنکھیں عطا کیں اور روح کو ایک آنکھ جس کو ہم وجدان کا نام دیتے ہیں، ذرائع علم میں ایک ذریعہ علم وجدان بھی ہے، بہت سے سائنس دانوں کی ایجادات کے بارے میں جب ہم کسی کتاب میں پڑھتے ہیں تو اس سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ کام اس سائنس داں نے وجدان سے ہی کیا، شاعروں کی شاعری میں وجدان کا بڑا اہم کردار ہے، ذہن ایک مافوق الفطرت شے ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بالا ہے اور لطافت کی وجہ سے تمام پیغامات اللہ رب العزت کے اس نور سے لیتا ہے جو اس کائنات میں پھیلا ہوا ہے، یہ نور روحی خفی کی صورت میں ہر وقت جاری و ساری رہتا ہے، کائنات میں موجود ہر ذرہ اور ہر انسان تک پہنچتا ہے اور اس میں تحریک پیدا کرتا ہے، یہ تحریک احساسات، خیالات اور ادراک کا سبب بنتی ہے، یہی ذہن ہے، جسمانی قوتیں پانچ ہیں جن سے ہم علم حاصل کرتے ہیں، ان میں قوت لامسہ، قوت باصرہ، قوت سامعہ، قوت شامہ اور قوت ذائقہ شامل ہیں، اسی طرح روح کی بھی پانچ قوتیں ہیں جن سے علم حاصل ہوتا ہے، ان میں ایک قوت متخیلہ جو تصور کے ذریعے

اشیا کو خیال میں لاتی ہے اور اس سے نتیجہ برآمد کرتی ہے، دوسری قوت متفکرہ جو تمام امور پر غور کر کے ان کی باریکیوں کی جانچ پڑتال کرتی ہے، تیسری قوت مدرکہ جو اشیا کے حقائق کا ادراک کرتی ہے، چوتھی قوت حافظہ، یہ ایسی قوت ہے جو انسان کے خیال، سوچ اور سمجھ کو یاد رکھتی ہے اور پانچویں قوت حس ہے، یہ قوت جسم اور روح میں مشترک ہے، ذہن کے ذریعہ علم روح تک پہنچتا ہے اور روح اپنی قوتوں کو عمل میں لاتی ہے ور اپنے جسم کے درمیان مشترک قوت کے ذریعہ اس علم کو دماغ تک منتقل کرتی ہے جس سے دماغ میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور دماغ اپنے ایک مخصوص نظام کے تحت اس تحریک کو جسم تک منتقل کرتا ہے جس کا اظہار ہمارے جسم کے مختلف اعضا سے ہوتا ہے، قوت حس نہ صرف روح کے پیغامات کو جسم تک لے جاتی ہے بلکہ یہ ظاہری قوتوں سے حاصل ہونے والے علم کو بھی روح تک لے جاتی ہے، مثلاً جب ہماری نظر پھول پر پڑتی ہے تو یہ ظاہری قوت یعنی قوت باصر ہمارے اندر ایک احساس پیدا کرتی ہے، اس احساس کو قوت حس باطنی قوتوں تک لے کر جاتی ہے، یعنی حس مشترک اس مشاہدے کو قوت خیال کے سامنے پیش کرتی ہے، قوت خیال اس پر تخیل و تصور کر کے اس کو قوت متفکرہ تک پہنچتی ہے، یہ قوت اس پر غور کر کے اس کو قوت مدرکہ کو منتقل کر دیتی ہے جو اس کی حفاظت کرتی ہے اور اس کو قوت حافظ کے محفوظ خانے میں محفوظ کر دیتی ہے، یوں روح اور جسم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

نتیجہ: اعضا کے پیچھے دماغ اس کے پیچھے روح اور روح کے پیچھے ذہن اور ذہن کے پیچھے اللہ رب العزت کی وہ نورانی لہریں جو کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہیں، ہمارے دماغ میں جو بھی خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ ذہن سے آتے ہیں اور ذہن ان پیغامات کو اللہ رب العزت کی نورانی لہروں سے موصول کرتا ہے، یوں دماغ اور ذہن کے مابین تعلق پیدا ہوتا ہے جس طرح روح کا جسم کے ساتھ تعلق ہے کہ جسم سے الگ وجود بھی رکھتی ہے اور جسم کے ساتھ منسلک بھی ہے، اسی طرح ذہن اور دماغ ایک دوسرے سے الگ وجود بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ منسلک بھی ہیں، یہ تعلق بھی اللہ رب العزت کی حکمت سے ہے، نبی پاکؐ پر وحی مختلف طریقوں سے آتی تھی، ان میں ایک طریقہ القا کا تھا، اسی طرح اللہ رب العزت کی نورانی لہریں براہ راست انسان کو پیغامات پہنچاتی ہیں جو ذہن سے ہوتے ہوئے دماغ تک پہنچ کر جسم تک منتقل ہو جاتے

ہیں، اس بات کی تصدیق ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی پاکؐ نے فرمایا کہ:

عن ابی هريرة رضى الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لم يبق من النبوة الا المبشرات ، قالوا : وما المبشرات ؟ قال الرويا الصالحة . (۱۴)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ نبوت منقطع ہوگئی اور سوائے مبشرات کے نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا، صحابہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ! مبشرات کیا ہے؟ (مبشرات کے معنی خوش خبری دینے والی چیزیں) جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ "سچے خواب" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشرات ہوتے ہیں اور یہ نبوت کا ایک حصہ ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ (۱۵)

اس کے ساتھ ہی یہ اشارہ بھی دیا کہ یہ سلسلہ میرے بعد بھی جاری رہے گا اور مومنوں کو سچے خواب دکھائے جائیں گے اور ان کے ذریعے بشارتیں دی جائیں گی۔

حوالہ جات

(۱) John Hospers, An Introduction to Philosophical Analysis, Rouledge & Kegan paul Limited, London, 0791 pp378-391۔ (۲) "سائنس ڈائجسٹ"، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۸۔ (۳) ڈاکٹر نعیم احمد، "تاریخ فلسفہ یونان"، علمی کتاب خانہ، لاہور، ص ۲۲۔ (۴) حوالہ سابق، ص ۲۶ و ۲۷۔ (۵) "سائنس ڈائجسٹ"، کراچی ۲۰۰۰ء۔ (۶) القرآن ۲۴:۳۵۔ (۷) القرآن ۲:۲۵۵۔ (۸) بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، "من کی دنیا"، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۷۹ و ۸۰۔ (۹) القرآن ۵۷:۲۸۔ (۱۰) القرآن ۳۹:۹۔ (۱۱) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۵، ۶۶۔ (۱۲) ابن خلدون، "مقدمہ ابن خلدون" مترجم مولانا سعد خان یوسفی، میرولی کتب خانہ، کراچی، ص ۲۲۸۔ (۱۳) "من کی دنیا"، ص ۲۲۸۔ (۱۴) صحیح بخاری، "كتاب التعبير ، باب المبشرات"، حدیث نمبر ۶۹۹۰۔ (۱۵) صحیح بخاری، "كتاب التعبير ، باب الرؤياء الصالحة"، حدیث نمبر ۶۸۹۸۷۔

اخبار علمیہ

دنیا کی اکثر زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، جس سے مذہب اسلام کے تعارف اور اس سے واقفیت کے دروازے وا ہوتے جارہے ہیں اور توفیق الٰہی کی یہ دولت بہت سے دل اس کی روشنی سے منور ہو رہے ہیں، حال ہی میں نیپالی زبان بھی اس سعادت سے مشرف ہوئی ہے، چنانچہ اسلامی سنگھ نیپال کی سربراہی میں پانچ سال کی مدت میں اس کا پہلا مکمل ترجمہ شائع ہو گیا ہے، اس خدمت کے لیے مالی اعانت ''القرآن اکیڈمی'' لندن نے فراہم کی ہے، اس کا اجراء کاٹھمنڈو میں ایک تقریب کے دوران عمل میں آیا، جس میں مسلم علما کے علاوہ ہندو اور بدھ مت کے متبعین نے بھی شرکت کی، یہ ترجمہ قرآن ۱۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس مکمل ترجمہ سے قبل صرف چند سورتوں کے ترجمے ہی نیپالی زبان میں دست یاب تھے، نیپال کی ۲۸ ملین آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۴ر اعشاریہ دو فیصد ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کی عربی صرف ونحو اور بلاغت کے موضوع پر ایک کتاب ''تلخیص المفتاح'' ہے، اس کے مصنف علامہ جلال الدین محمد بن عبدالرحمان القزوینی الشافعی معروف بہ ابن خطیب (م ۷۳۹ھ) ہیں، سعد تفتازانی (م ۷۹۱ھ) نے ''المطول علی التلخیص'' کے نام سے اس کی شرح لکھی، تاہم ابراہیم بن محمد بن عرب شاہ اسفرائینی (م ۹۵۱ھ) کی شرح ''الاطول'' اپنے عہد کی مشہور شرح ہے، الاطول کا تقریباً ڈیڑھ سو برس قدیم مطبوعہ نسخہ جمعۃ الماجد متحدہ عرب امارات کے ذخیرۂ مخطوطات میں موجود ہے، اس کا پورا نام ''الاطول شرح تلخیص المفتاح'' ہے، اسفرائینی نے اپنی شرح کے دوران تفتازانی کی مذکورہ شرح کو بھی پیش نظر رکھا تھا، اس کے علاوہ متعدد مشہور ماہرین فن بلاغت جیسے شیخ عبدالقاہر جرجانی، ابن سنان الخفاجی، امام رازی، بدرالدین ابن مالک، صاحب ابن عباد، ابن العمید، مرزوقی، مبرد، ابن اثیر، جاحظ، نظام اور سید شریف جرجانی وغیرہم کے خیالات سے استفادہ بھی اس میں کیا گیا ہے اور بلاغت کی متعدد اصطلاحات جیسے اصوات، استغراق، قصر اور تشبیہ وغیرہ سے متعلق اکثر جگہوں پر ان سے اختلاف بھی کیا ہے اور بعض دوسرے شارحین کے طریقوں اور اصولوں کی نشان دہی بھی کی ہے اور خود بھی اس

کی شرح میں الگ انداز واسلوب اختیار کیا ہے، مثلاً شارحین کے آرا نقل کرتے وقت اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ اصلی متن کا مفہوم باقی رہے، مختلف فیہ مسائل میں تطبیق بھی دینے کی کوشش کی ہے، نیز اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے اشعار کے علاوہ آیات قرآنیہ سے استدلال کیا ہے، ان ہی خصوصیات کی بنا پر تلخیص کو فن بلاغت اور صرف ونحو پر ایک مستند کتاب کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس کا مطالعہ عام اہل علم اور طلبہ کے لیے مفید ہے، ۱۸۶۷ء میں مطبعۃ العامرہ ترکی سے شائع ہوئی تھی۔

اٹلی کے رہنے والے مائیکل سٹیلیا نے کمپیوٹر کی اسکرین کو دیکھے بغیر ۶۴ر کتابیں الٹی ٹائپ کی ہیں اور یہ تمام کتابیں اپنی اصلی زبانوں میں ہیں، انہوں نے ۲۶ر جولائی ۲۰۰۷ء کو قدیم عبرانی میں مکمل Dead Sea Scrolls کو الٹا ٹائپ کرکے اپنا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کرالیا ہے، کتابوں کو الٹا ٹائپ کرنے کا مظاہرہ انہوں نے بچپن ہی میں یعنی دسویں جماعت کے دوران ہی شروع کردیا تھا، ان کے اس حیرت انگیز کارنامہ کے سبب انہیں متعدد سرکاری و غیرسرکاری انعامات واعزازات سے نوازا بھی جاچکا ہے۔

ارسیسا اور رائل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ آن ہسٹری مریکو نے ایک مشترکہ عالمی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا ہے، اس کا موضوع ''سلطنت عثمانیہ میں مغرب اور مغربی بحیرۂ روم'' ہے، یہ کانفرنس ۱۲-۱۴ر نومبر ۲۰۰۹ء کو رباط میں ہوگی، اس کا مقصد سلطنت عثمانیہ میں جنوبی افریقہ کے ملکوں کی تاریخ پر تحقیق اور مطالعہ کو فروغ دینا ہے، کانفرنس میں سیاسی، اقتصادی، انتظامی، تہذیبی اور سماجی صورت حال جس سے دیہی اور شہری طرز معاشرت اور تعلیمی و تعمیراتی سرگرمیوں کا اندازہ ہوسکے، کو موضوع بحث بنایا جائے گا، علمی تحقیقات، مطبوعات، مآخذ ومراجع کی کتابیں، تاریخی دستاویزات، سیاحوں کے بیانات اور پریس وغیرہ سے متعلق موضوعات کے علاوہ سلطنت عثمانیہ اور مغرب کے عقائد ونظریات بھی زیر بحث آئیں گے۔

اٹلی کے سفارت خانہ کی ایک خبر کے مطابق اٹلی کے طلبا اور ماہرین لسانیات کو بنگلہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور سے خاصی دل چسپی ہے، اس مشہور زمانہ بنگالی ادیب وشاعر سے اٹلی والوں کی دل چسپی دیکھ کر وہاں کی گیارہ یونی ورسٹیوں نے اپنے یہاں ٹیگور کو پڑھانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لیے الگ الگ شعبے قائم کرنے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے، رپورٹ میں یہ بات بھی درج

ہے کہ ٹیگور کے افکار ونظریات کا مطالعہ کرنے کے لیے اٹلی کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد ہندوستان کارخ کررہی ہے، اس کے علاوہ شعبہ لسانیات کے وابستگان بھی بنگلہ زبان وادب سے دل چسپی لے رہے ہیں، یہاں یہ تذکرہ مناسب ہے کہ ۱۹۱۳ء میں ٹیگور کو ان کی تصنیف ''گیتانجلی'' کے لیے نوبل انعام تفویض کیا گیا تھا۔

''برٹش جرنل آف کینسر'' کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بحیرۂ روم کے علاقہ کی غذائیں اپنے کھانوں میں شامل کرلینے سے کینسر کے امکانات میں ۱۲ فیصد کمی آجاتی ہے، ۲۶ ہزار یونانی افراد پر کیے گئے تجربہ کے بعد پتہ چلا ہے کہ صرف روغن زیتون استعمال کرنے سے کینسر کے امکان میں ۹ فیصد کمی ہوجاتی ہے، اس اہم تحقیق کی ضرورت ماہرین کو اس وقت محسوس ہوئی جب انہیں اسپینی اور یونانی علاقوں میں امراض قلب کی شرح کے کم ہونے کا علم ہوا، محققین نے اپنے تحقیقاتی جائزہ میں کہا ہے کہ بحیرۂ روم کے باشندے بالعموم ہری سبزی اور مچھلی کھاتے ہیں اور کھانے زیتون کے تیل میں پکاتے ہیں، محققین نے یونان کے مختلف عمر کے ہزاروں لوگوں کو یہ ترغیب دی تھی کہ آٹھ سال تک صرف بحیرۂ روم کی غذا ہی استعمال کریں، چنانچہ انہوں نے اس تجربہ میں دیکھا کہ اس کی پابندی کرنے والے دوسروں کے مقابلہ میں کینسر کے خطرے سے ۹ فیصد محفوظ تھے۔

۱۵/۱۶/۱۷/ اگست کو مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن آف جاپان کی سہ روزہ کانفرنس جاپان کے شہر اوساکا میں منعقد ہوئی، اس میں مصر، پاکستان، بنگلہ دیش، ملیشیا، انڈونیشیا، الجیریا، تیونس، فلسطین اور دوسرے ملکوں کے ہونہار طلبہ نے شرکت کی، سعودی عرب کی ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ سے وابستہ پروفیسر عصام حامد عبدالحفیظ اور محمد البباطری اور جامعہ ازہر کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر سمیر الشیخ نے اس کانفرنس میں متعدد اسلامی موضوعات پر انگریزی اور عربی زبان میں لکچر دیے اور حاضرین کے سوالات کے جواب دیے، دوسیشن جاپانی غیر مسلموں کے لیے مخصوص تھے، اس میں ۱۳۰/ جاپانی شریک تھے، ایک غیر مسلم پروفیسر خاتون اور جاپانی اسکالر سلیمان ہمانکا کو بھی خیالات کے اظہار کا موقع دیا گیا، کانفرنس میں مذہب اسلام کے مستقبل اور اسلامی طریقہ تدریس ونظام تربیت پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی گئی۔

ک ص اصلاحی

وفیات

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد

ڈاکٹر مختار الدین احمد*

افسوس ہے کہ فارسی واردو کے مشہور استاد، نامور محقق، بین الاقوامی شہرت کے ممتاز مصنف اور رسالہ ''معارف'' کے رکن ادارت پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد طویل علالت کے بعد یکشنبہ ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۸ء کی صبح کو علی گڑھ میں وفات پاگئے، دوسرے دن مغرب کے بعد یونیورسٹی کے قبرستان میں ان کے دوستوں، عقیدت مندوں، تلامذہ اور اعزہ کی موجودگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی، خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

نذیر احمد، ضلع گونڈا (اترپردیش) کے ایک گاؤں میں ۳/ جنوری ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے، تعلیم دانش گاہ لکھنؤ میں حاصل کی، انہوں نے ۱۹۴۰ء میں فارسی میں ایم-اے کیا اور وہیں سے ۱۹۴۵ء میں فارسی زبان وادب میں انہیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی، ان کا مقالہ ''ظہوری کی حیات اور کارنامے'' پر تھا جو انہوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی نگرانی میں لکھا تھا، ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ''عادل شاہ کے عہد کے فارسی گویوں'' پر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۵۶ء میں عادل شاہ کی تصنیف ''نورس'' کی ترتیب وتحقیق پر اسی یونی ورسٹی سے انہیں اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری ملی، ۱۹۵۵ء میں حکومت ہند کے وظیفے پر وہ ایران گئے، تہران یونی ورسٹی سے انہوں نے پہلوی اور جدید فارسی میں ڈپلوما حاصل کیا اور وہاں کے اہم اساتذہ سے انہوں نے علمی فیوض حاصل کیے۔

وہ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لکچرر مقرر ہوئے، ۱۹۵۷ء میں حکومتِ ہند کے ایک علمی منصوبے کے تحت اردو کی تاریخ زبان وادب کی ترتیب کے لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایما پر وہ علی گڑھ آئے اور اس منصوبے پر وہ ۱۹۵۸ء تک کام کرتے رہے، اسی سال وہ شعبۂ فارسی میں ریڈر اور ۱۹۶۰ء میں پروفیسر مقرر ہوئے، دوسال تک وہ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے، ۱۹۶۰ء میں یونی ورسٹی نے جب ''مجلہ فکر ونظر'' شائع کرنا شروع کیا تو ڈاکٹر یوسف حسین خاں

---

* علی گڑھ۔

اس کے ایڈیٹر اور ڈاکٹر نذیر احمد سکریٹری اور ان کے نائب مقرر ہوئے، ان کی چھ سال کی محنت اور توجہ سے "فکر و نظر" کا شمار اعلا درجے کے علمی و تحقیقی مجلات میں ہونے لگا، وہ ۱۷ سال تک شعبۂ فارسی کے صدر رہ کر ۱۹۷۷ء میں دو سال کی توسیع کے بعد سبک دوش ہوئے، سبک دوشی کے بعد بھی وہ علی گڑھ میں مقیم اور علمی و ادبی کاموں میں بہ دستور مصروف رہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے ایران، افغانستان، پاکستان، سعودی عرب، کویت، عراق، انگلستان، روس اور امریکا کے متعدد بار علمی سفر کئے اور وہاں کی متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی، وہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے تاحیات ٹرسٹی رہے، ایک مدت تک وہ اس ادارے کے سکریٹری پھر اس کے نائب صدر، پھر صدر مقرر کیے گئے، وہ ایک عرصے تک فارسی و اردو کے تحقیقی و علمی رسالے "غالب" کے ایڈیٹر رہے اور مجلات انڈو ایرانیکا (کلکتہ)، معارف (اعظم گڈھ)، بیاض (دہلی) کے ایڈیٹوریل بورڈ کے سرگرم رکن۔

انہوں نے بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شعری تصنیف اور قدیم دکنی اردو کی اہم دستاویز "کتاب نورس" متعدد مخطوطات کی مدد سے مرتب کر کے ۱۹۵۵ء میں شائع کی، اس کا ہندی انگریزی اڈیشن مع مقدمہ و ترجمہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا، اس کا دوسرا اڈیشن ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی تہذیب و تزئین کے بعد کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا، اس کتاب کا کنڑی زبان میں ترجمہ پروفیسر عبدالحمید خاں نے کیا ہے جسے اکادمی نے بنگلور سے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی اہم تالیفات یہ ہیں:

"مکاتیب سنائی"، طبع اول، دانش گاہ اسلامی علی گڑھ ۱۹۶۲ء، طبع دوم کابل ۱۹۷۷ء، طبع سوم تہران ۱۳۶۴ شمسی، طبع چہارم زیر طبع، "دیوان سراجی سگزی خراسانی"، طبع دانش گاہ اسلامی علی گڑھ ۱۹۷۲ء، "نقد قاطع برہان" طبع ایوان غالب، دہلی ۱۹۸۵ء، "دیوان عمید لوبکی" نشر مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۵ء۔

انہوں نے دیوان حافظ کے بعض نادر و اہم مخطوطات (نسخ آقائے ہاشم علی سبز پوش، گورکھپور نسخہ مورخہ ۸۲۴ھ (اس کے سات اڈیشن نکل چکے ہیں)، ایا صوفیہ ترکی نسخہ مورخہ ۸۱۳ھ و نسخہ مورخہ

۸۱۸ھ) کے تنقیدی علمی عکسی اڈیشن ایران سے شائع کیے۔

قدیم فارسی فرہنگوں سے ڈاکٹر نذیر احمد کی خاص دل چسپی تھی، انہوں نے فخر الدین مبارک شاہ قواس غزنوی کی مرتب کردہ فرہنگ قواس ۱۹۷۴ء میں، حاجب خیرات دہلوی کی دستور الافاضل تہران سے اور بدر ابراہیم کی تالیف فرہنگ زفان گویا و جہان پویا، کتاب خانہ خدابخش پٹنہ سے دو جلدوں میں ۱۹۸۹ء و ۱۹۹۷ء میں شائع کی ہے، فیروز شاہ تغلق کے عہد (۷۵۳ھ-۷۹۰ھ) کی فارسی فرہنگ لسان الشعرا ایران کلچرل ہاؤس، نئی دہلی سے ۱۹۹۵ء میں انطباع پذیر ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مقالات کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱- تحقیقی مقالات، لکھنؤ ۱۹۵۴ء۔ ۲- تاریخی و ادبی مطالعے، علی گڑھ ۱۹۶۱ء۔ ۳- تاریخی اور علمی مقالات (ترجمہ کبیر احمد جائسی)۔ ۴- غالب آشفتہ، آرٹس فورم، ملتان ۱۹۹۶ء۔ ۵- غالب پر چند مقالے، نشر ایوان غالب، نئی دہلی ۱۹۹۶ء۔ ۶- غالب پر چند تحقیقی مطالعے، نشر ایوان غالب، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء۔

ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان اور امریکا کے مختلف مجلات میں فارسی و اردو زبان و ادب، لسانیات، تاریخ و تمدن، خطاطی و ثقافت و موسیقی وغیرہ موضوعات پر اردو فارسی اور انگریزی زبانوں میں ان کے ایک ہزار سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں، زبان و ادب فارسی، تاریخ ایران و ہند اور نسخہ شناسی و کتاب شناسی کے موضوعات پر ان کے ۱۸ فارسی مقالات کا مجموعہ ڈاکٹر سید حسن عباس کی تلاش و جستجو سے "قند پارسی" کے عنوان سے تہران سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے، ان کے فارسی مقالات کا دوسرا مجموعہ موقوفات محمود افشار کے زیر اہتمام چھپ گیا ہے۔

ان کا مرتب کردہ دیوان مہندس لاہوری زیر طبع ہے، وہ ایک عرصے تک کچھ دانش مندوں کی مدد سے "اعجاز خسروی" کے انگریزی ترجمے میں مصروف رہے جو امریکا سے شائع ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کو ۱۹۸۷ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے "پدم شری" کا اعزاز، ۱۹۷۶ء میں، ایوان غالب نئی دہلی کا فخر الدین علی احمد انعام اور ۱۳۶۸ شمسی میں زبان و ادبیات فارسی کی تدریس و تحقیق کے صلہ میں انہیں تہران میں "جایزۂ ادبی و تاریخی ڈاکٹر محمود افشار" تفویض ہوا اور اسی سال انہیں تہران یونی ورسٹی سے فارسی پروفیسر کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی، ایران میں اسلامی جمہوریت کے قیام کے بعد یہ پہلی اعزازی ڈگری ہے جو کسی ایرانی یا غیر ایرانی کو تفویض ہوئی ہے۔

آثار علمیہ وتاریخیہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام اہل علم کے خطوط (۵)

(۱)

C-396, Defence Colony,

New Delhi - 24

۳۰/اکتوبر ۱۹۷۲ء

محب مکرم، آداب وتسلیمات

گرامی نامے کا شکریہ، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ نذر عابد (اردو، انگریزی) کے دونوں حصے آپ کو مل گئے، کاش کہ آپ یہ بھی لکھتے کہ آپ کو پسند آئے۔

میرے پروگرام میں اسی طرح کی دو جلدیں اور ہیں، ایک کرنیل سید بشیر حسین زیدی کے لیے اور دوسری حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد کے لیے، آپ غالباً دونوں بزرگوں کو جانتے ہوں، دونوں چشمۂ خیر اور خدام ملک وقوم میں سے ہیں، میری دلی تمنا ہے کہ یہ دونوں کتابیں بھی مرتب کرسکوں، کیا آپ اپنے روایتی تعاون سے کام لیتے ہوئے ان دونوں جلدوں کے لیے بھی مضمون دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

اب آپ کو یہ لکھنا کہ ممنون ہوں گا، کچھ رسمی سی بات ہوگی، آپ نے ماضی میں ہمیشہ میری دست گیری کی ہے، اس لیے یہ تصور نہیں کرسکتا کہ اب میرا ساتھ چھوڑ دیں گے!

پچھلی اگست مجھ پر دل کا دورہ پڑا، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے، بچالیا لیکن یہ ایک طرح کی تنبیہ تو ہوگئی، اس لیے چاہتا ہوں کہ حتی الامکان یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ ہی مکمل کرکے شائع کردوں، اس لیے مزید شکریہ کا باعث ہوگا، اگر آپ یہ دونوں مضمون جلد عنایت

فرمائیں، اپنی دعاؤں میں اس خاکسار کو یاد رکھیے گا۔

خدا کرے آپ ہر طرح خوش وخرم ہوں، آمین! خدا معلوم اب ملاقات کب ہوتی ہے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

(۲)

C-396, Defence Colony,

New Delhi - 24

۲۲/فروری ۱۹۷۵ء

محب مکرم، آداب وتسلیمات

میں جانتا ہوں کہ میں یہ خط بہت دیر سے لکھ رہا ہوں، پہلے دو مضمون موصول ہوئے، پھر ۱۵/جنوری کے گرامی نامے میں ایک مضمون کا استدراک تھا، میں اضمحلال طبع کے باعث نہ رسید لکھ سکا، نہ شکریہ ادا کرسکا، اب معافی بھی چاہتا ہوں اور دلی شکریہ بھی ادا کرتا ہوں، خدا آپ کو خوش وخرم رکھے اور مفید سے مفید تر کام، دینی اور دنیوی کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین ثم آمین۔

میری صحت ہنوز معمول پر نہیں آئی، اصل بات یہ ہے کہ یہ احساس ہر وقت ٹہوکے دیتا رہتا ہے کہ تم بیمار ہو، اس نفسیاتی کیفیت کے باعث طبیعت کا مضمحل رہنا بالکل قدرتی بات ہے، خوش قسمتی سے کئی برس سے مجھے سامان معیشت کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی، جہاں دو ایک جگہ جانا تھا، وہ بھی اعزازی جگہیں تھیں، میں نے ان اصحاب سے درخواست کی کہ وہ کام گھر پر بھیج دیا کریں، انہوں نے تعاون کیا اور مجھے دفتری حاضری سے معافی دے دی، بہرحال آپ سے دعا کے لیے خواستگار ہوں کہ حضرت شافی مطلق اپنا فضل خاص شامل رکھیں، آمین۔

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر وعافیت ہوں، آمین۔

مضامین کے لیے پھر شکریہ قبول فرمائیے اور تاخیر کے لیے معاف فرمادیجیے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۳)

۲۴ میسن روڈ، لاہور

مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۵۹ء

مکرمی جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب

آپ کی کتاب سیرت دو جلد میں آج موصول ہوئی ، دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء ،اتنی ضخیم کتاب پر جس قدر محنت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے ،جس نے اس قسم کا کام کبھی کیا ہو،صرف بھی بہت ہوا ہوگا، معلوم نہیں فرانس میں کتاب فروش کہاں تک ایسی کتابیں بیچ سکتے ہیں؟ ہمارے ملک میں تو فرانسیسی جاننے والے بہت ہی کم ہیں ، بہرحال ایک نسخے کے لیے میں نے لائبریری کو لکھ دیا ہے، کل شام کو اوکچ صاحب کا پتہ بھی موصول ہوگیا، امید ہے کہ آپ نے انہیں سربیا والے آرٹیکل کے متعلق لکھ دیا ہوگا، میں خود بھی لکھنے لگا ہوں۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے پہلے دو جز (۶۴ صفحہ فی جز) چھپ گئے ہیں، آپ جرمن سے بخیریت واپس تشریف لائیں گے تو آپ کی خدمت میں ارسال کیے جائیں گے، انشاءاللہ تعالیٰ۔

والسلام مع الاکرام

مخلص - محمد شفیع

(۴)

این ر ۷ ، ۴، سمن آباد، لاہور نمبر ۴

۲۸ر جولائی ۶۷ء

محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

گرامی نامہ ابھی ملا ، آپ کی نوازش کا احسان مند ہوں ، آپ نے ہمارے مجوزہ مجموعے کے لیے جتنی زحمت گوارا فرمائی ہے، اس کا شکریہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ادا کیا جائے، اللہ تعالیٰ ہی آپ کو اس کا اجر دے گا۔

پہلے گرامی نامے کا جواب ابھی تک اس لیے نہیں دیا تھا کہ آپ نے فرمایا تھا کئی ہفتے سفر پر رہیں گے، آپ کا مضمون میں نے عیادت صاحب کو پہنچا دیا تھا (اتفاق سے وہ بالکل ہمسائے میں رہتے ہیں)، میں کس لائق ہوں کہ آپ کے مضمون کی "تصحیح و اصلاح" کروں گا، البتہ اپنا تاثر پیش کرتا ہوں، انگریزوں نے جو Linguistis کا نیا علم ایجاد کیا ہے اس کی بنیاد ان کے اعلان کے بہ موجب اس اصول پر ہے کہ انسانی زبان سے مابعدالطبعیات (یعنی روحانی معنویت) کو خارج کیا جائے، اس مجموعے کی ترتیب میں میری شمولیت بھی اسی غرض سے ہے کہ مضمون نہایت موثر اور کارآمد ہے، ذاتی طور پر مجھے تو آپ کا مضمون پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ اسے پڑھنے والوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے، آمین۔

والساں صاحب نے آپ کا ترجمہ کیا ہوا مضمون بھیج دیا تھا، یہ تو آپ نے بڑی عنایت فرمائی ہے کہ اپنی مصروفیتوں کے باوجود آپ نے ترجمے کی زحمت گوارا فرمائی، یہ ترجمہ ابھی تک میرے پاس رکھا ہے، آپ نے فرمایا ہے کہ یہ ترجمہ نامکمل ہے، میں اصل فرانسیسی سے ملا کر دیکھ لوں گا اور جو فقرے ترجمے سے رہ گئے ہیں، انہیں ترجمہ کردوں گا، دوسرے مضمون کا ترجمہ خود کرلوں گا۔

بلکہ یہ ترجمے کا کام تو میں اب تک کر بھی لیتا لیکن گو میں اچھا تو ہو گیا ہوں مگر ابھی تک کمزوری اتنی ہے کہ کوئی کام نہیں کرسکا، جولائی کا مہینہ بھی بیکار ہی گیا، ایک مثل سنی تھی، ٹھیک طرح یاد نہیں، بارش برسے ایک گھڑی تو چھپّر برسے آٹھ گھڑی، یہی حال آج کل کی انگریزی دواؤں کا ہے، پچھلے مہینے دو انجکشن کلوروکوئن کے لینے پڑے جس سے بخار تو ایک دن میں اتر گیا لیکن کمزوری ایسی ہوئی کہ اب تک نہیں گئی۔

والساں صاحب کی صحت کے متعلق خبر سے تشویش ہوئی ، اللہ تعالیٰ انہیں تندرستی عطا فرمائے، میں نے انہیں کل ہی خط بھیجا ہے، ہم لوگ ان کے نہایت ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے ہمارے مجموعے کے لیے اتنی دل چسپی سے اور زحمت اٹھا کر مضمون جمع کیے، ان کی صحت کے

لیے ہم دعا گو ہیں۔

شیخ محمد اشرف صاحب سے متعلق جو کام تھا وہ میں ابھی تک نہیں کر سکا، معلوم ہوا ہے کہ دو یا ڈھائی سال ہوئے ان کے صاحب زادے کا انتقال ہوگیا، وہی مرحوم کتابوں کا سارا کام کرتے تھے، اس لیے طباعت و اشاعت کا کام اب پہلے کی طرح نہیں ہو رہا، علاوہ ازیں کہتے ہیں کہ اس رنج میں اشرف صاحب کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ کسی سے ٹھیک طرح بات نہیں کرتے، یہاں کے ایک ناشر جن کے ان سے دیرینہ کاروباری تعلقات ہیں، وہ یہ حال سنا رہے تھے، جب سے آپ کا خط آیا ہے میں اس فکر میں ہوں کہ شیخ صاحب کے کسی ایسے دوست کو لے کر ان کے پاس جاؤں جن کی وساطت سے کوئی صحیح جواب مل سکے، انشاء اللہ لاہور کے قیام کے دوران میں یہ بھی معلوم کروں گا کہ لاہور میں آپ کی کتاب ''الوثائق'' کا ترجمہ کس نے شائع کیا ہے۔

۳۱؍جولائی

پرسوں آپ کی کتاب ''الوثائق'' کا ترجمہ بھی مل گیا، اسے ۶۰ء میں ''سیاسی وثیقہ جات'' کے نام ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے ترجمہ کیا ہے اور مجلس ترقی ادب، لاہور نے شائع کیا ہے، جو ایک سرکاری ادارہ ہے، کتاب پر لکھا ہے:

"With thanks to and kind permisoin of Dr. M. Hamidullah, Paris (France)"

اردو میں بھی یہی عبارت درج ہے۔

میں یہ کتاب آج آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں اور ساتھ ہی مفتی صاحب قبلہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ بھی جو انہوں نے آپ کے لیے عنایت فرمایا تھا۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

نیاز مند

محمد حسن عسکری

ادبیات

قرآن ہے سرچشمہ فیضان وہدایت

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

قرآن ہے سرچشمہ فیضان و ہدایت / ہے نوع بشر کے لیے جو وجہ سعادت
دراصل ہے یہ مظہر اسرار حقیقت / ہم لوگ سمجھ کر جو کریں اس کی تلاوت
تاریکی اوہام کے سب چھٹ گئے بادل / روشن ہوئی مکہ سے جو اک شمع رسالت
ہے وسعت کونین کا ادراک اسی سے / سائنس کی ایجاد اسی کی ہے علامت
جو کچھ بھی میسر ہے ہمیں اس کی یہ دولت / کرتے نہیں ارباب نظر اس پہ قناعت
تحقیق کا یہ سلسلہ ہے جاری و ساری / کرتا ہے جو اسرار حقیقت کی وضاحت
جس کی شب معراج تھی اک نقطۂ آغاز / سٹ لائٹ اب اس بات کی دیتے ہیں شہادت
ہیں شمس و قمر آدم خاکی پہ مسخر / قرآن کی آیات میں ہے جس کی وضاحت
سائنس نے اس بات کو سچ کر کے دکھایا / یہ ایک حقیقت ہے نہیں کوئی حکایت
تسخیر قمر آج کیا نوع بشر نے / قرآن میں پہلے ہی سے تھی اس کی بشارت
پیدا کیا انسان کو قدرت نے علق سے / اب اس کی بھی سائنس سے ثابت ہے صداقت
فطرت کے اشارات پہ ہم کرتے نہیں غور / حق بات ہے لوگوں کے لیے بار سماعت
اقبال میں تھی جرأت رندانہ مگر آج / کرتا ہی نہیں کوئی روایت سے بغاوت
ہو علمی تناظر میں جو قرآن کی تفسیر / ہو جائے گی اسرار حقیقت کی وضاحت
میزان کا جو سورۂ رحمٰن میں ہے ذکر / ہے ارض و سماء کی اسی محور پہ عمارت
طوفان کہیں ہے تو کہیں پر ہے سنامی / ظاہر ہیں جدھر دیکھیے آثار قیامت
یہ سب ہے توازن میں خلل کا ہی نتیجہ / بے شک ہے توازن میں خلل وجہ ہلاکت

تحقیق کا ہر ایک عمل احمد علی آج
قرآن کے ارشاد پہ ہے مہر صداقت

598، ذاکر نگر، نئی دہلی۔

مطبوعات جدیدہ

THE ARAB - ROMANCE PARNASSU : از ڈاکٹر محمد ثناء اللہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۴۸،
قیمت: ۱۲۰۰ روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ،
یوپی اور سامیہ پبلی کیشنز A-۱۸۱ر۴، ایس۔ایس نگر، سول لائنس، علی گڑھ۔

اندلس یا مملکت ہسپانیہ آج بھی عالم اسلام کے لیے داستان پارینہ کی بجائے ہجر و فراق کی ایسی کہانی ہے جس میں قرب و وصال کی آرزو، پوری طرح زندہ ہے، جب ہسپانیہ کی یاد آتی ہے تو اس احساس کے ساتھ کہ وہ مانند حرم پاک ہے اور اس لیے ہے کہ اس کی سرزمین، خون مسلماں کی امین ہے، اندلس کا دور نشاط افزا جب سامنے آتا ہے تو ایک ہوک اس حسرت کے ساتھ اٹھتی ہے کہ دوش کے آئینے میں شاید شکل فردا پھر سے نظر آجائے، خاک میں پوشیدہ، مسجدوں کے نشان اور باد سحر میں خاموش اذاں کو بوئے یمن اور رنگ حجاز کا انتظار آج بھی ہے، زیر نظر کتاب نے ایک بار پھر خوش دل و گرم اختلاط اور سادہ و روشن جبین غزالان اندلس کی یادوں کو زندہ کر دیا، اندلس کی سیاسی اور فوجی تاریخ اور اس کی پر عظمت تہذیب اور ثروت مند تمدن پر ہمارے اہل قلم کی کاوشیں خاصی ہیں لیکن ایک ندوی نوجوان کے قلم سے انگریزی میں زیر نظر کتاب اپنے موضوع کی وسعت اور انفرادیت کی وجہ سے ایک خوش گوار حیرت و مسرت کی باعث ہے، جس میں اندلس کی شاعری اور خصوصاً بربط دل پر چھیڑے گئے اس کے نغمات شوق کے آہنگ اور ترنم کی بازگشت جرمنی، سسلی، فرانس، اطالیہ اور سوئزرلینڈ کی وادیوں تک میں سنی اور سنائی گئی ہے، کتاب اصلاً چھ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں (شمالی و مغربی) افریقہ اور یوروپ میں اسلام کی آمد اور اس کی تہذیب و ثقافت کے باران کرم سے پہلے ان خطوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، بعد کے ابواب میں عربوں کی شعر گوئی یا شعر الحب والہوی اور نئی تہذیب میں نئے اندلسی چمن زار شعر کے علاوہ قرون وسطی کی فرانسیسی غزلیہ اور رزمیہ شاعری اور پھر اٹلی اور اس سے بھی آگے اس شاعری کے اثرات کا مطالعہ و تجزیہ، جس وسعت اور محققانہ اور نقادانہ ژرف نگاہی سے کیا گیا ہے،

اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ اور مباحث کے حوالہ جات کی کثرت سے بہ آسانی کیا جاسکتا ہے، کتاب کا مقصد بھی واضح ہے کہ اندلس کے عربوں کے اور احسانات کی طرح آج کے یورپ کو اور اس کی آج کی شاعری اور موسیقی کو اندلس کی شاعری کا احسان مند ہونا چاہیے، جس نے ظلمت خانہ یورپ کو اعلا انسانی جذبات اور دل کے واردات اور عشق و محبت کی پاکیزہ ترین سوغات دے کر ادب عالیہ کے اعلا منازل کی راہوں کو پر انوار اور ہموار کیا، فاضل مصنف کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"The trochaic poetry of the troubadours kindled the torch of refined love".

اندلسی شاعری کے وسیع تر اثرات کی نشان دہی اس سے بھی ہوتی ہے کہ گیارہویں، بارہویں صدی میں خواتین شاعرات کی تعداد بھی اچھی خاصی نظر آتی ہے، ایک بحث میں خلیفہ محمد المستکفی کی بیٹی ولادہ کی شاعری کا الگ ذکر ہے، اندلس کے ایوان شعر میں ولادہ کے نغموں کی گونج سب سے جدا ہے، بالکل اس کی شخصیت کے مانند جو بہ ظاہر تمام تر بے حجابانہ تھی لیکن عفت بہر حال مسلم تھی، ولادہ کا ذکر ہو تو ابن زیدون کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے، جو اندلس کا مرزا غالب تھا، اس کتاب میں ابن خفاجہ، ابن ہانی اور ابن حزم اور ابن عربی بھی ہیں اور اندلس کی لوک شاعری کی اصناف موشح اور زجل کا جادو جس طرح فرانس، جرمنی، اٹلی، پرتگال اور انگلستان تک پہنچا، لائق مصنف کی نظر بھی وہاں تک خوب پہنچی ہے، یہ کتاب انگریزی ادب کے لیے ایک بہترین چشم کشا تحفہ ہے، کاش اس کے مشمولات مختصر ہی سہی اردو میں بھی آجاتے۔

وقائع بابر: مترجم جناب یونس جعفری، حواشی و جزئیات جناب حسن بیگ،
تقطیع کلاں، بہترین کاغذ اور طباعت، صفحات ۴۰۰، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، پتہ:
شہر بانو پبلی شرز، ۱۷- میتھون روڈ کریکاڈی کے وائی ون ون ٹی ایس، برطانیہ
اور انڈس پبلی کیشنز، ۲۵ فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

بانی سلطنت مغلیہ ظہیر الدین محمد بابر کے اولوالعزم مرد میداں، فاتح، مدبر، منتظم اور ہوش مند حکمراں ہونے کا اعتراف و اقرار ایک تاریخی حقیقت ہے اور یہ بھی کہ وہ اسی درجہ صاحب علم، صاحب قلم اور شعر و ادب کا انجمن آرا بھی تھا، اس کی یادداشتوں کا مجموعہ تزک بابری یا بابر نامہ یا

واقعات بابری یا وقائع بابر کے مختلف ناموں سے معروف ہے، جس کے متعلق اور خوبیوں کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فضلا کی صحبت اور شعرا کے مطالعہ سے بابر کے علمی ذوق میں جو جلا پیدا ہوئی، یہ مجموعہ اسی کا نتیجہ ہے اور آج اس کا شمار دنیا کے بہترین علمی اور تاریخی سرمایہ میں کیا جاسکتا ہے، بابر کی اصل زبان ترکی تھی، اس نے اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا لیکن فارسی اور پھر دنیا کی مختلف زبانوں کے ارباب کمال نے بابر نامے کو اپنے لیے منتقل کیا، اردو میں مرزا نصیر الدین حیدر کا ترجمہ گذشتہ صدی کے اوائل میں تزک بابری کے نام سے شائع ہوا، اب زیر نظر وقائع بابر ترجمہ نگاری کی اسی روایت کا جدید ترین حصہ ہے اور بابر جیسے عظیم المرتبت کشور کشائے ارض وفن کی شان کے عین مطابق ہے، فاضل مترجم کے متعلق کہا گیا کہ وہ دلی میں فارسی کے استاد رہے ہیں اور یہ ترجمہ ان کی دو سالہ محنت کا ثمرہ ہے، اچھا ہوتا اگر مترجم کے بارے اور بھی معلومات درج کردیے جاتے، پہلے ترجمے اور اس ترجمے میں قریب ستر سال کا فرق ہے اور اس مختصر تبصرے میں تقابل کی گنجائش بھی نہیں، تاہم زبان کی صفائی اور عبارت کی ہمواری ظاہر ہے، پہلے ترجمے میں بھی حواشی تھے لیکن اس طبع جدید کے حاشیے اس کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت ہیں، فاضل حاشیہ نگار نے جدید ترین معلومات کے حصول کے لیے بابر کے وطن ترکستان کا سفر کیا، ازبکستان، تاجکستان اور کرغیزستان اور افغانستان میں وہ مقامات بابر کی دید سے شادکام ہوئے، اس علمی سفر اور اس کے اہتمام کا سارا اثر ان کے حواشی میں منتقل ہوا اور اسی خوبی نے وقائع بابر کو امتیازی شان عطا کردی، ان کے دل چسپ سفر کی روداد بھی کتاب میں شامل ہے، بعض قدیم نادر مرقعوں کے ساتھ جدید ترین تصویریں اور نقشے اس پر مستزاد ہیں، بعض جزوی مباحث بھی موقع سے پیش کیے گئے ہیں، جیسے بابر کے تلفظ کا اختلاف، بابَر، بابِر اور بابُر تینوں کے قائلین کے اپنے دعوے ہیں، معارف میں سید نجیب اشرف ندوی نے بابُر کو زیادہ صحیح قرار دیا تھا لیکن فاضل محشی کی نظر میں بہ وجوہ بابَر ہی زیادہ درست ہے، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ چوں کہ بابر ترک تھا اس لیے اس کے خاندان کو مغلیہ کہنا بھی نادرست ہے، کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے کتاب اعلا درجہ کی ہے لیکن افسوس ہے کہ کتابت کی تصحیح اس شان کی نہیں، پہلے ہی صفحہ پر "قواعد" کی جگہ "قوائد" اور پھر "علاقاجات"، "جے"، "متابقت" وغیرہ اور "اعظم" کا املا "آعظم" وغیرہ ناگوار گزرتے ہیں، مرزا گورگانی کے ترجمے کے متعلق اس تعبیر میں غرابت ہے کہ "اس کے

حواشی تہ بالا امروز نہیں تھے"، بہرحال اس بیش قیمت پیش کش کے لیے مترجم، محشی اور ناشر قدر اور قبول کے مستحق ہیں اور لائق تحسین وستائش ہیں۔

(1) *STRAY REFLECTIONS, A NOTE BOOK OF ALLAMA IQBAL*

از ڈاکٹر جاوید اقبال، قیمت: ۱۵۰ روپے۔

(2) *IQBAL, THE POET OF TOMORROW*

از جناب خواجہ عبدالرحیم، قیمت: ۲۰۰ روپے۔

(3) *THE POET OF THE EAST*

از جناب اے، انور بیگ، قیمت: ۲۱۰ روپے۔

(4) *IQBAL'S RECONSTRUCTION OF IJTIHAD*

از جناب محمد خالد مسعود، قیمت: ۱۲۵ روپے۔

اقبال اکادمی پاکستان کی ان مطبوعات کے ناموں سے ان کے مباحث کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً اول الذکر کتاب علامہ کی چند یادداشتوں پر مشتمل ہے، زیر مطالعہ کتابوں پر، اپنے گردوپیش پر اور طالب علمانہ زندگی کے کچھ واقعات پر، ان کے خیالات ہیں اور علامہ کے قلب و ذہن کو سمجھنے کے لیے یہ مطالعات اقبال میں مفید و معاون ہوسکتے ہیں، شاعر مشرق اور شاعر فردا اور اجتہاد کی تشکیل جدید کے مفکر کی حیثیت سے باقی کتابوں میں بحث کی گئی ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں عرصے سے تعارف کی منتظر تھیں لیکن وقت اور صفحات دونوں کی کمی اس فریضے کی انجام دہی میں مانع تھی، تین سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے، اس لیے ہم معذرت کے ساتھ صرف ان کتابوں کے ناموں پر اکتفا کرتے ہیں، ان کے ساتھ دو اور کتابیں اقبال ایسیز اینڈ اسٹڈیز اور ہاؤ ٹو ریڈ اقبال بالترتیب پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور جناب شمس الرحمان فاروقی کی ہیں، دوسری کتاب کے مدون اور جامع جناب محمد سہیل عمر ہیں، دل چاہتا ہے کہ ان کتابوں کا ذرا مفصل ذکر آئے، بہرحال اقبال اکادمی پاکستان کے شکریے کے ساتھ ہم سردست ان کتابوں کے اس سرسری تعارف تک محدود ہیں، مطالعات اقبال کے شائقین کو بہرحال اقبال اکادمی پر اعتبار ہے۔

غالب، بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷: از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۶، قیمت: ۶۰ روپے، پتہ: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔

یہ کتاب اصلاً فاضل مصنف کا وہ مقالہ ہے، جس کو انہوں نے گذشتہ سال مرزا غالب کے ۲۱۰ ویں یوم ولادت پر غالب اکیڈمی میں پیش کیا، ۱۸۵۷ کی ڈیڑھ سو سالہ یاد کی مناسبت سے غالب اور ظفر کی یادوں کو بجا طور پر اس مقالہ کا موضوع بنایا گیا، فاضل مقالہ نگار مطالعہ کی وسعت، گہرائی اور نتائج کے درست اخذ و ادراک کے لیے معروف ہیں، اس سے پہلے ان کی ایک کتاب غالب اور ہماری تحریک آزادی بھی شائع ہو چکی ہے، جس کے متعلق کہا گیا کہ خواجہ حسن نظامی کے تالیف کردہ ایک روزنامچہ کے علاوہ اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ مختصر کتاب اپنے مباحث کی وجہ سے صرف ایک کمی کو ہی پورا نہیں کرتی بلکہ نفس موضوع پر ایک گہرے مطالعہ کی دعوت بھی دیتی ہے، انہوں نے اپنے مآخذ کی نشان دہی کر کے دراصل اپنے مطالعہ کی صحت سمت متعین کردی ہے، اثنائے کلام ان کا یہ قول بعضوں کے لیے حیرت کا سبب ہو سکتا ہے کہ "غالب اس معنی میں بدقسمت تھے کہ انہیں اچھے نقاد نہیں ملے، اس لیے آج بھی ان کے بہت سے اشعار کے اصل معنی اور ان تک رسائی دلانے والی کیفیتیں عام نہیں ہوئی ہیں" غالب اور ۱۸۵۷ کے تعلق سے ان کا قول فیصل یہ ہے کہ "۱۸۵۷ کے تناظر میں غالب کا رویہ ہندوستانیوں کے لیے ہمدردانہ کم تھا"، یہ خیال غالب اور بہادر شاہ کے باہمی تعلق کے بیان میں اور زیادہ تلخ نظر آتا ہے، ظفر کے بارے میں یہ خیال بھی درست ہے کہ "ہندوستانی سپاہیوں اور انگریزوں سے برسرپیکار عوام کے ایک بڑے طبقے نے انہیں متحدہ ہندوستان کے رہنما کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا"، ان کا یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جو لوگ ۱۸۵۷ کی مسلم مزاحمت کو صرف ناکامی اور تباہی سے تعبیر کرتے ہیں، انہیں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ۱۸۵۷ کے ہی نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا اور انگریزوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ان کے لیے ہندوستانیوں کے دلوں میں کیسی نفرت ہے، اس مختصر کتاب یا مقالے میں ایسے عناصر ہیں جو بسط و تفصیل کے طالب ہیں، فاضل مصنف سے اس اجمال کے اطناب کی خواہش بے جا نہیں۔

ع ۔ ص

سلسلہ ادب و تنقید

			Pages	Rs
۱۔ شعر العجم (اول)	علامہ شبلی نعمانی		274	85/-
۲۔ شعر العجم (دوم)	علامہ شبلی نعمانی		214	65/-
۳۔ شعر العجم (سوم)	علامہ شبلی نعمانی		192	35/-
۴۔ شعر العجم (چہارم)	علامہ شبلی نعمانی		230	90/-
۵۔ شعر العجم (پنجم)	علامہ شبلی نعمانی		206	38/-
۶۔ کلیات شبلی (اردو)	علامہ شبلی نعمانی		124	45/-
۷۔ کلیات شبلی (فارسی)	علامہ شبلی نعمانی		118	45/-
۸۔ موازنہ انیس و دبیر	علامہ شبلی نعمانی		312	95/-
۹۔ شعر الہند (اول)	مولانا عبدالسلام ندوی		496	80/-
۱۰۔ شعر الہند (دوم)	مولانا عبدالسلام ندوی		462	75/-
۱۱۔ اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی		410	-
۱۲۔ انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی		224	45/-
۱۳۔ نقوش سلیمانی	مولانا سید سلیمان ندوی		480	75/-
۱۴۔ خیام	مولانا سید سلیمان ندوی		528	90/-
۱۵۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں (اول)	سید صباح الدین عبدالرحمن		364	115/-
۱۶۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں (دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمن		402	50/-
۱۷۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات	سید صباح الدین عبدالرحمن		70	15/-
۱۸۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	سید صباح الدین عبدالرحمن		358	70/-
۱۹۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول)	خورشید احمد نعمانی		422	140/-
۲۰۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دوم)	خورشید احمد نعمانی		320	110/-
۲۱۔ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام	عبدالرزاق قریشی		236	75/-
۲۲۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت	عبدالرزاق قریشی		266	40/-
۲۳۔ گل رعنا	مولانا عبدالحی حسنی		580	75/-
۲۴۔ صاحب المثنوی	قاضی تلمذ حسین		-	-
۲۵۔ اردو غزل	پروفیسر یوسف حسین خاں		762	120/-